

منایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوزر، صدق سلمان

اسلام انسانیت کا دین ہے (برکاتِ خلافت)

از قلم
بابائے خلافت

اٹھو میری دنیا کے مکینوں کو بتا دو
غیر اللہ کی غلامی کے ہر پھندے کو اڑا دو

اسلام انسانیت کا دین ہے (برکاتِ خلافت)

از قلم
بابائے خلافت

دارالسلام و ایڈانٹاؤن لاہور

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔)

نام کتاب	:	جواز خلافت
مصنف	:	چودھری رحمت علی
ترتیب و تدوین	:	ال عمران چودھری
اشاعت بار اول	:	گیارہ سو
تاریخ اشاعت	:	ذی الحجہ 1429ھ
		دسمبر 2008ء
ناشر	:	احمد عرفان دارالسلام، واپڈا ٹاؤن، لاہور
مطبع	:	میٹر و پرنٹر زچیمبر لین روڈ، لاہور
قیمت	:	70/- روپے

دارالسلام واپڈا ٹاؤن، لاہور

فون: 4 - 5183123 - 042

فہرست

iii	پیش لفظ
1	☆ اسلام انسانیت کا دین ہے
8	☆ اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت
10خلاق
14قییموں کی فلاح و بہبود کا فکر
18قییموں کے علاوہ دوسرے محتاجوں کی فلاح و بہبود
23	☆ انسان کی دیگر ضروریات
23وصاند فی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت
24احسان کا طریقہ اختیار کرو
25حق تلفی کی ممانعت
25	1۔ حقوق اللہ
27	2۔ حقوق العباد
28	3۔ حقوق النفس
30	☆ بنیادی حقوق
31حق ملیت
33حقوق جاں
39نئی زندگی کا تحفظ

42حق آزادی
47ظلم کے خلاف احتجاج کا حق
50حق مساوات
52معاشی تحفظ کا حق
56حصول انصاف کا حق
59تنظیم سازی کا حق
60معصیت سے اجتناب کا حق
61سیاسی زندگی میں شرکت کا حق
62آزادی نقل و حرکت اور سکونت کا حق
64اجرت اور معاوضہ کا حق
66خاصہ کلام و چند شبہات اور ان کی وضاحت
76	☆ مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات
82	☆ اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا
84سزائیں بطور آخری چارہ کار
88اسلامی سزاؤں کا مزاحمتی پہلو
88اسلامی سزاؤں کا اصلاحی اور تہذیبی پہلو
90	☆ اسلامی جہاد (مسلم جدوجہد) کیوں؟
95	☆ ضمیر: یہ لاف یہ عطا آخر کیوں؟

پیش لفظ

قرآن و سنت کی روشنی میں لکھی گئی اس تصنیف کا ہر گھر..... مسلم ہو
کہ غیر مسلم..... میں ہونا انتہائی سودمند ہے۔ نیز وہ حضرات جن کے پاس
وقت کی کمی ہو آخری حصہ یعنی ”خلاصہ کلام“ شہادت اور ان کی وضاحت“
ضرور پڑھیں۔ والسلام

دعا گو

(چودھری رحمت علی)

اسلام انسانیت کا دین ہے

قرآن مجید۔۔ آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کتاب کا آغاز ”رب العالمین“ کی حمد سے ہوتا ہے تو اختتام لفظ ”نکاس“ سے۔ اس کتاب جسے بشمول پہلی مازل شدہ کتب آسمانی قرآن مجید ”الکتاب“ کا نام دیتا ہے میں انسانوں کے خالق و پروردگار سے آغاز و انسان سے اختتام کیا گیا تو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس انوکھی، یکتا اور عظیم کتاب کا موضوع ”انسان“ ہے۔ پھر چونکہ انسانیت اس کرۂ ارض پر وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری وارد ہونے والے انسان پر مشتمل ہے لہذا ظاہر ہے کہ جب جملہ آسمانی کتابوں کا مجموعہ یعنی الکتاب انسان کے متعلق ہے تو دوسرے نکتوں میں اس کام طلب ہے کہ یہ انسانیت کی کتاب ہے۔ اسی بات کا مزید احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چند بنیادی حقائق کا پہلے ادراک کر لیا جائے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جب الکتاب انسان و انسانیت کی کتاب ہے تو اس کام طلب ہے کہ وہ انسان کی تحقیق دوسری جہات کے بارے میں اسکی حیثیت مقصد تخلیق آدم اس دنیا میں انسانی زندگی گزارنے کے قوانین و ضوابط انسان اور کائنات کے باہمی تعلق اللہ اور انسان کے باہمی تعلق کی پوری روئید و ادو لقم بیان کرتی ہے۔ اسی نظام کا نام ”اسلام“ ہے۔ یہ کتاب پتہ دیتی ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا میں وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری انسان کے وارد ہونے والے انسان کے لئے زندگی گزارنے کا پسندیدہ نظام ”اسلام“ ہے۔ انسانی تاریخ کے مختلف مرحلوں پر انسان خود بے جا مداخلت کر کے مختلف نسبتوں کی آڑ میں دین اسلام کو اسلام کی بجائے دوسرے ناموں سے موسوم کرتے رہے ہیں جیسے یہود کی نسبت سے یہودیت اور عیسائی کی نسبت سے عیسائیت وغیرہ۔ باحفاظہ دیگر یہ خود ساختہ اصطلاحات انسانی اختراعات ہیں ہمارے خالق کی طرف سے نہیں لہذا اللہ کے نزدیک ظاہر ہیں ما پسندیدہ ہیں۔

دوسری حقیقت یہ کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ قرآن مجید میں مذہب کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ بتائیں دین اور مذہب کی اصطلاحات کو سمجھنا بڑا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں دین کی اصطلاح کوئی معانی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اکثر و بیشتر یہ اصطلاح ”نظام“ یعنی انسانی نظام زندگی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ یعنی اللہ انسان کو پابند کرتا ہے کہ وہ اسی نظام زندگی یا دین کو پائے جو ”الکتاب“ میں بیان ہوا ہے۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ الکتاب میں بیان کردہ دین کی جو ایک اہم شق ہے وہ انسان کے مقصد تحقیق کے متعلق ہے نہ کہ صرف مسلمان کے مقصد تحقیق کے متعلق۔ اللہ کا فرمانا ہے:

”میں نے جی اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات: ۵۶)

اللہ کی زندگی و عبادت کا حق محض چند مراسم عبودیت یعنی نماز روزے وغیرہ سے پورا نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو بھی جب زندگی کے ہر شعبہ بمثل سماجی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی، عسکری وغیرہ میں اسی قانون اور اسی نظام کے مطابق عمل پیرا ہوا جائے جو الکتاب میں بیان ہوا ہے۔ یہ ہر دائرہ کار میں اللہ کے عطا کردہ قانون کا کارفرما ہونا دین ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کا چند لحاظ مراسم عبودیت میں گزارا اور باقی زندگی الکتاب میں بیان کردہ قوانین و ضوابط کی بجائے اپنی من مرضی یا خود ساختہ قوانین کے مطابق گزارا ”مذہب“ ہے۔ دین پوری انسانی زندگی کو بطور ”کل“ (As a whole) لیتا ہے جبکہ مذہب چند مراسم عبودیت کے علاوہ پوری زندگی کو الکتاب میں بیان کردہ قوانین و ضوابط سے خارج رکھتا ہے۔ یہ بھی کہ مذہب انسانی زندگی کو دو علیحدہ علیحدہ دوائر یعنی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی میں تقسیم کرتا ہے۔ سیکولرازم بھی بڑی حد تک یہی ہے۔ پھر یہ بھی کہ مذہب صرف یہ دو دائرہ ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے حلقہ اثر میں ”مذہبی لوگ“ اور ”سیاسی لوگ“ جیسے دو تین (Distinct) گروہ بھی پیدا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ کہ الکتاب میں دی گئی ہدایات قوانین کا سرچشمہ صرف ایک ذات یعنی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ اس نے دنیا میں پہلے پیدا ہونے والے انسان کو زندگی گزارنے کی وہی سہولتیں اور ہدایات دی ہیں جو کہ اس دنیا میں وارد ہونے والے آخری انسان کو۔ اگر فرق کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو حمد فی زندگی کے

ارتقاء کے وجہ سے۔ اسی لئے اللہ (سبحانہ و تعالیٰ) نے پوری انسانی تاریخ پر وقفہ وقفہ سے انبیاء و رسول کو مبعوث فرمایا جتنا کہ وقت کے ساتھ اگر ہدایات و قوانین میں کوئی تبدیلی ضروری ہو تو دین کی تجدید ہوتی رہے ایسا کرنے کے لئے دو واضح تبدیلیاں کی گئیں:

پہلی تبدیلی یہ کہ پہلی آسمانی کتابیں بمثل زبور و تورات، انجیل وغیرہ میں وہی ہدایات دی گئی تھیں جن پر اس وقت کے تمدن ارتقاء کے مطابق عمل کرنا ممکن تھا۔ یعنی وقت کے اس مخصوص سوز پر مائل کردہ ہدایات و قوانین اس وقت کے لئے تو مکمل تھیں لیکن پوری انسانی تاریخ کے لحاظ سے جزوی تھیں۔ مکمل ہدایات جو پورے کرۂ ارض پر محیط ہو سکتی تھیں بعد میں اس وقت جاری کیں جب تمدن ارتقاء خود اس حد تک ٹھہرا کہ پوری دنیا ”ایک گاؤں“ کی صورت اختیار کرنے لگی۔ ذرائع ابلاغ اور آمدورفت میں بے مثل انقلاب آنے لگا۔

دوسری تبدیلی یہ کہ جب دین اور الکتاب کی تکمیل ہو گئی تو آسمانی کتابوں کی تزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ پھر جب آسمانی کتابوں کی تزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو ظاہر ہے مزید انبیاء و رسول کی بعثت کے سلسلے کی ضرورت نہ ہونے کی بنا پر آخری رسول ﷺ بھیج کر اس سلسلے کو بھی منقطع کر دیا گیا۔ اب تاقیامت پایہ تکمیل کو پہنچنے والی ہدایات و قوانین پر مشتمل کتاب ”قرآن مجید“ ہے تو انسانی سطح پر مبعوث ہونے والے آخری نبی ﷺ یا بلاغہ ظاہر نبی کا ناس ﷺ ”محمد ﷺ“ ہیں۔ پہلے والی کتابیں بھی اقوام کی سطح کی اور جزوی تھیں اور پہلے والے انبیاء بھی انسانیت کی سطح کے نہ تھے بلکہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث تھے۔ عجمی کتاب اور عجمی نبی ﷺ اس وقت متعارف کرائے گئے جب اللہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے“ (مائیدہ: 3)

موضوع سخن یعنی ”اسلام انسانیت کا دین ہے“ کی طرف آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں بیشتر اصولی ہدایات و قوانین انسانیت کی سطح کے ہیں نہ کہ محض مسلمان کی سطح کے۔ ان میں چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

”اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان

سب کا خالق ہے تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے“ (بقرہ: 21)۔

”ہم نے کہا تم سب (انسان) یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“ (بقرہ: 39)

”ابتدا میں سب انسان ایک ہی طریقہ پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر اجازت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق مازل کی تاکر حق کے بارے میں لوگوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرنے“ (بقرہ: 213)

”انسانوں کے لئے مرغوبات نفس۔۔۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ذخیرے، چیدہ بھوڑے، موسیقی اور زرعی زمینیں۔۔۔ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سلمان ہیں بہتر ٹھکانہ تو اللہ کے پاس ہے“ (آل عمران: 14)

”اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک معقفس سے تم کو پیدا کیا۔۔۔“ (انعام: 98) ”ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے“ (انعام: 132)

”اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔ کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا“ (اعراف: 31)

”اے انسانو! رب کے غضب سے بچو حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے پیے سے غافل ہو جائے گی نہرِ حالم کا حمل گر جائے گا اور انسان تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہو گئے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا ہوگا“ (حج: 1-2)۔

”بعض انسان ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے جتے ہیں“ (حج: 3)۔

”اے انسانو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں علوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نطفے سے پھر خون کے قطرے سے پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل دلی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت مقررہ تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے باوجود پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا تو یکایک وہ پھلک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات انگلی شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہیں“ (حج: 4-5)

”بعض اور انسان ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں“ (حج: 8-9)

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (حجرات: 13)۔

”کیا نہیں آیا انسان پر ایک لامتناہی زمانہ جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟ ہم نے انسان کو ایک جھوٹے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھانیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا“ (دھر: 1-3)

”اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نیک نیک سے درست کیا۔ تجھے مناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟“ (انقطاع: 6-8)

”ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا“ (بلد: 4)

”ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا“ (انہیس: 4)

”جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ بلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یاس کو کیا ہو رہا ہے“ (زلزال: 1-3)

”زمانے کی قسم انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور

نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور مہر کی تلقین کرتے رہے“ (عصر: 1-3)

”تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہے جیسے ایک نفس کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے والا اور سننے والا ہے“ (لقمان: 28)

کہنے کو تو یہ چند آیات ہیں لیکن ان میں اسلام کا پورا فلسفہ ہے کہ انسان ہے کیا؟ اس کا اپنے پروردگار اور دوسری مخلوق سے کیا تعلق ہے؟ اسکی ابتدا، اور انتہا، کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان آیات سے یہ امر دو اور دو چار کی طرح عیاں کہ قرآن مجید کا موضوع ”انسان“ ہے اور یہ کہ ”اسلام انسانیت کا دین ہے“۔ پھر صواب دہی اختیارات (Discretionary Powers) ہونے کی وجہ سے دنیا میں آنے والے انسان چونکہ دگرگوہوں میں سبے ہوئے ہیں ایک ماننے والے اور دوسرے نہ ماننے والے قرآن ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ زیر بحث لاتا ہے۔ یعنی آپ کو اس کتاب میں ماننے والوں (مسلم) اور نہ ماننے والوں (غیر مسلم) کا ذکر علیحدہ علیحدہ ملا ہے۔ البتہ ہر ذکر سے مترشح یہی ہوتا ہے کہ ”اسلام انسانیت کا دین ہے“۔ آئیے پہلے دیکھیں کہ قرآن عورت اور مرد کو کس پیرائے یا حیثیت سے لیتا ہے؟

اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت

کوئی بھی کھریلو یونٹ یا کھریلو یونٹوں کے مجموعے سے بننے والا معاشرہ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ معاشرے کے نظم، سکون اور راحت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مرد و زن کی باہمی حیثیت فطری یعنی اللہ کی وضع کردہ ہو۔ اسلام یعنی دینی فطرت میں مرد کے مقابلہ میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بطور انسان، بطور جنس، بطور بیوی اور بطور اولاد۔ بطور انسان، اسلام مرد اور عورت کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں کرتا۔ دونوں کی حیثیت بالکل یکساں۔ ایسا نہیں کہ عورت کوئی اچھا کام کرے تو ویسا ہی اچھا کام کرنے والے مرد کی بہ نسبت اسے کم اجر و ثواب ہو۔ اسی طرح دونوں میں سے کوئی بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے یکساں سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے مرد سے بھی بطور انسان برتاؤ ہوگا تو عورت سے بھی اسی

طرح بطور انسان۔ بالفاظ دیگر بطور انسان دونوں بر لحاظ سے یکساں۔ قرآن مجید میں آیا:

”ان کے رب نے فرمایا ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت“ تم سب ایک دوسرے میں سے ہو“ (بقرہ: 195)۔

بطور جنس اسی طرح ان کے دائرہ کار اور ذمہ داریوں میں فرق ہے جیسے کہ ان کی فطری جنس میں فرق ہے۔ بطور جنس اسلام نے مرد کو ان کاموں کے لئے مختص کیا ہے جو نیا دہ دوزد صوب اور محنت طلب ہیں۔ دونوں کے دائرہ کاری کو اس طرح مختص کیا ہے کہ قدم قدم پر اس کی داد دینا پڑتی ہے۔ گھر کے باہر کے کام روزی کمانے اور دوسرے مشقت کے کام، زمانے بھر میں دوزد صوب کر کے گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے کام مرد کے سپرد کئے ہیں۔ حمل وزچلی بچوں کی پرورش و دیکھ بھال، گھر میں مرد کے لئے سہولیات مہیا کرنے کی سعادت عورت کے فرائض قرار دیئے ہیں۔ ایسی بے ترتیبی و بے مروتی نہیں کہ عورت بچے بھی اٹھائے پھرے اور روزی کمانے کے لئے مرد کے شانہ بٹانہ تنگ و دو بھی کرے۔ عینہ ایسا بھی نہیں کہ مرد سارا دن بیرونی کاموں میں کھنے کے بعد رات بھر بچوں کی نگہداشت بھی کرے، کھانا بھی پکائے، کپڑے بھی دھوئے اور گھر کی صفائی بھی کرے۔ بنا بریں اسلام نے مرد و زن کے دائرہ کار کو ایک دوسرے سے علیحدہ (Distinct) واضح اور ایسا کہ جو ہر ایک کی جسمانی ساخت اور فطری میلان کے عین مطابق ہو دو ٹوک مختص کیا ہے۔ تجربہ شاہد کہ جن معاشروں نے اس فطری تقسیم میں مداخلت کرتے ہوئے ان کے کام کے ان مخصوص دائرہ ہائے کار کو درہم برہم کیا ہے نہ گھر کے رہنے نگھاٹ کے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر برباد سکون تباہ اولاد گمراہ والدین یوں جیسے بوجھ ہو گئے۔ ترس گئے کون و مکان گھریلو چابوت اور سکون کو۔ گھروں میں کتوں اور بلیوں نے ڈیرے آجمائے۔

بطور بیوی اسلام عورت کو مرد کی معاون قرار دیتا ہے اور یہ بھی ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا انتظامی یونٹ، طبی، سہولت و سلجھاؤ رواں دواں رہ سکتا ہے کہ اس کے دو نہیں صرف ایک سربراہ ہو۔ کسی ادارے یا ڈائریکٹوریٹ کے اگر یکساں اختیارات کے حامل دو ڈائریکٹر ہوں تو ایسا ادارہ نہیں چل سکتا۔ بنا بریں اسلام گھریلو یونٹ جو درحقیقت بہت اہم اور بنیادی یونٹ ہے جس میں مرد

کو قوام (سربراہ) تو عورت کو اس کا معاون قرار دیتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو عورتیں صالح ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں“ (نساء: 43)۔

یعنی شوہر کو بیوی کا نگران و محافظ بنایا ہے تو ایک تو اس بنا پر کہ دونوں کے اختیارات یکساں نہ ہوں بلکہ ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو یعنی ان میں سے مرد سر کردہ ہو تو عورت اس کی معاون اور دوسرے پر فضیلت و قوامیت اس لئے کہ خاوند کمانا ہے تو بیوی اس کی کمائی سے استفادہ کرتی ہے۔ اصل میں مرد کی کمائی میں عورت کی اپنی محنت کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ عورت اگر مرد کی معاونت نہ کرے اور گھریلو کام کاج کو نہ سنبھالے تو مرد کا حق اس قابل ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کمائی کرے۔ یعنی بغرض انسانی ضرورت اگر بیوی کو معاون یا گھریلو یونٹ میں نمبر 2 پر رکھا ہے تو اس کا مداوا (Compensation) اس طور کیا ہے کہ بیوی اولاد اور بوڑھے والدین کا مان و نفقہ مہیا کرنے کی مشقت مرد پر ڈالی ہے اور عورت کو یہ سہولت باوجود اس کے دی گئی ہے کہ خود وہ وراثت میں بقدر درجہ حصہ دار ہوتی ہے اور بنا بریں حامل ملکیت ہوتی ہے۔

بطور بچوں کی ماں تو اسلام نے تینوں کے تینوں تمغے ماں کے سپرد کر دیئے۔ محروم رکھا ہے ان سے تو والد کو۔ ظاہر ہے کسی بھی کھیل یا مشق میں عموماً پہلا دوسرا و تیسرا انعامات یا تمغے ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ تینوں تمغے والدہ کے سینے پر سجا دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس بارے میں نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی فرمایا:

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”پھر تیرا باپ“۔ پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں“ (بخاری، مسلم)۔

یعنی اس معاملے میں اسلام ماں کو نمبر 1 پر رکھتا ہے تو والد کو نمبر 2 پر۔

طلاق

ایک اور انسانی ضرورت ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے یا شادی کرنے کی ہے تو اس سے بھی اہم بوقت ضرورت شادی کے بندھن کو توڑنے یعنی طلاق کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی بہت اہم لیکن اس سے بھی اہم تر ہے بوقت ضرورت طلاق۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی گاڑی کی اصل خصوصیت اس کا چلنا ہے۔ لیکن کسی بھی گاڑی کا چلنا خود موت کا بندوبست کرنا ہے اگر اس میں بوقت ضرورت رکنے کی خصلت نہ ہو۔ میاں بیوی انسان ہیں اور بعض اوقات ان کے مابین حالات استعد رکشیدہ ہو جاتے ہیں کہ دونوں کو بطور میاں بیوی رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں دورا سہ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جگہ پر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں یعنی چاہیں تو کوئی اور کھربالیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں طلاق کی سہولت یا طلاق کے بعد کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت نہ ہو جیسے کہ آج کی دنیا میں کئی معاشروں میں ایسا ہے۔ آخری صورت میں تو خودکشی تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ”ستی“ کی رسم اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے انسان کی اس ضرورت کو بطریقہ حسن پورا کیا ہے یعنی بوقت ضرورت طلاق کی بھی اجازت دی ہے تو طلاق کے بعد مرد و زن ہر ایک کو کسی دوسری جگہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی بھی۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے زیادہ کوئی کام مایہ پسند ہے تو ”طلاق“۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے طلاق کی اجازت تو دی ہے لیکن آخری چارہ کار کے طور پر۔ اسلام طلاق کی نوبت تک پہنچنے کے لئے متعدد مصالحتی اقدامات کی سفارش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ کس طرح میاں بیوی کے علیحدہ ہونے کا مرحلہ طے جائے۔ ذیل میں ہم ایسے چند اقدامات کا ذکر کرتے ہیں:

☆ سب سے پہلے شوہر کو خطاب کر کے ہمیشہ ہمیش کے لئے تاکید کی گئی کہ بیوی کی خصلت میں کوئی کمی ہو تو اس کا حل یہ ہرگز نہیں کہ فوراً علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ دور ہو جائے یا اس کی کہہ تے ہوئے اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری ایسی خوبیاں دے رکھی ہوں کہ اس ایک کی کا احساس ہی نہ رہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہیں ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں

ما پسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت بھلائی رکھ دی ہو“ (نساء: 19)۔

☆ بیوی کو بھی صلح جوئی اور مصالحت کی طرف راغب کیا فرمایا:

”جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رشتی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر مایاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو اللہ تمہارے اس عمل سے بے خبر نہ ہوگا“۔ (نساء: 128)۔

☆ اکٹھے رہتے ہوئے چھوٹی موٹی تو شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں لہذا مایاں بیوی دونوں کو تلقین کی کہ وہ باہم فیاضانہ برتاؤ کا رویہ اپنائیں۔ فرمایا:

”آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔“ (بقرہ: 237)۔

☆ رنجش و ناراضگی کی صورت میں اگر بات گھر سے باہر نکل جائے تو اسلام پھر بھی زوجین کو دھیرے دھیرے قریب لانے کی کوشش کرنا اور طلاق کی نوبت کو حتی الوسع مانگنے کی کوشش کرنا ہے۔ ایسے میں وہ مالشی طریقے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اور اگر تم لوگوں کو کہیں مایاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کر دو وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے“ (نساء: 35)۔

”طلب یہ ہے کہ مایاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک فرد مصالحت کے لئے مقرر کیا جائے۔ وہ دونوں معاملے کی تحقیق کریں کہ خرابی کہاں ہے؟ پھر اس خرابی کو حتی المقدور رفع کرنے کی کوشش کریں تا کہ نزاع سے احتطاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

ان تمام احتیاطی و مصالحتی اقدامات کے باوجود اگر طلاق کی نوبت آجی جائے تو اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ مرد طلاق ایام ماہواری میں نہیں ایام طہر میں دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی۔ حضرت

عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ اس واقعہ پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: عبد اللہ اپنی بیوی کو واپس کرے اور اس کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اس کے بعد طلاق دینا ضروری ہو تو پاک ہونے کی حالت میں اس کو طلاق دے دے اور اس عرصہ میں اس کو ہاتھ نہ لگائے۔ (مشکوٰۃ)

ایسا اس لئے کیا کہ ایام طہر میں میاں بیوی میں رضا مندی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ مصلحت اس میں یہی ہے کہ کس طرح وقوع طلاق ٹل جائے۔ طلاق دینے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ خود اس مصلحت کو چھپائے ہوئے ہے کہ کسی طرح جدا ہونے والے میاں بیوی کھوٹ کر کے پھر جو جائیں۔ چنانچہ جموعی طلاق خود تین طلاقوں پر مشتمل ہے۔ اور ان تین طلاقوں میں وقفہ سالہا سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی رکانہ نے اپنی بیوی کو عہد رسالت میں طلاق دی لیکن جلد ہی رجوع کر لیا۔ پھر عمرؓ کے عہد خلافت میں دوسری دفع طلاق دی اور قریب میں ہی رجوع کر لیا۔ تیسری طلاق انہوں نے حضرت عثمانؓ کے دور میں دی (مشکوٰۃ)۔ مطلب یہی کہ طلاق کا کڑوا کھوٹ نہ ہی پیا جائے تو بہتر۔ اس لئے کہ اصل ضرورت تو کھر کو بسا ہے نہ کہ ویران کرنا۔

یاد رہے تیسری دفع طلاق دینے سے باہم رجوع کرنے کی سہولت ختم ہو جاتی ہے جب تک کہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہ کرے اور دوسری جگہ سے کسی وجہ سے اسے طلاق ٹل جائے۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ طلاق کہیں محض اذیت کا ذریعہ نہ بن جائے جیسے کہ دور جہالت میں ایسا ہی تھا۔ پھر اسلام یہی نہیں کرتا کہ سخت گرفت کرنا ہے اگر طلاق کو ضرر رسانی کا ذریعہ بنایا جائے بلکہ وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مطلقہ عورت کی کہیں اپنی مرضی سے شادی کرنے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لویا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے پر ہی ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔“ (بقرہ: 231)۔

قربان جائیں اسلام کی انسانیت پروری پر وہ تو جدا ہونے والی سابقہ بیوی سے حسن سلوک کی

تاکید کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے یہ حق ہے حقیقی لوگوں پر“ (بقرہ: 241)۔

ایک اور جگہ پر حسن سلوک کی تلقین کی۔ فرمایا: ”اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آئے گا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے (جدا ہونے والی بیوی) ڈھیر سا رمال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لے لیا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہے“ (نساء: 20-21)۔

قیموں کی فلاح و بہبود کا فکر

یہ انسانی سانحہ ہے کہ جدا ہونے والے مرد کو بھی کوئی اور عورت مل جاتی ہے اور جدا ہونے والی عورت کو بھی کوئی اور مرد مل جاتا ہے۔ اصل خسارہ ہوتا ہے یا مشکل میں پڑتے ہیں تو بچے جو حقیقی والدین کے سایہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے جیسے کہ انسانی تھانا ہے اس مسئلے کو بھی نہ صرف اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ اس کو حل کرنے کی مقدور پھر کوشش بھی کی ہے۔

احقر امام انسانیت کی یہ انتہا ہے کہ یتیم بچے خواہ طلاق کی صورت میں وجود پذیر ہوں یا والد کی وفات کی صورت میں اسلام ان کی بہبود و بقا کی فکر اس وقت سے کرتا ہے جب ابھی وہ رحم مادر میں ہوں۔ اسلام نے اس مقصد کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا ہے جسے وہ عدت کا نام دیتا ہے۔ عدت اس پیریڈ کا نام ہے جو طلاق یافتہ عورت یا بیوہ عورت کو دوسری شادی کرنے سے پہلے شادی کے انتظار میں اس لئے گزارا ہونا ہے کہ صراحت سے واضح ہو سکے کہ عورت کیا حاملہ تو نہیں؟ حاملہ ہونے کی صورت میں تو اسے تا وضع حمل و بحالی صحت دوسری شادی کرنے کی اس لئے اجازت نہیں ہے کہ بچے کی ولدیت اور حق وراثت متاثر نہ ہوں۔ دوسری شادی تو درکنار دوران عدت عورت کو مزید نسبت طے کرنے یا دو ٹوک دوسرے مرد سے منگنی کرنے کی اجازت نہیں یعنی اسلام یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ جب بچہ پیٹ میں ہو تو عورت کی رگوں میں دو محبتوں یعنی سابقہ شوہر اور ہونے والے شوہر کی محبت بھرا خون گردش کرے۔ اس لئے کہ اس سے ہونے والے بچے کے اوصاف

پر فرق پڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”زمانہ عدت میں خواہ تم ان عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو خواہ دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دلوں میں آئے گا ہی مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔“ (بقرہ: 235)۔

یہ تو ہوئی یتیم کے حقوق کی اس وقت کی بات جب وہ ابھی رحم مادر میں ہے لیکن اسلام جیسے کہ انسانی مطالبہ ہے یتیموں کی پرورش، دیکھ بھال اور مفادات کی لواحقین و متعلقین کو بڑی تاکید۔ بعض اوقات تو جذباتی انداز میں تاکید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم چند آیات و احادیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے ان بچوں کی رضاعت کا مسئلہ حل ہونا چاہئے جن کے والدین علیحدہ ہو چکے ہوں۔ اسلام اس انسانی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتا ہے قرآن مجید میں آیا:

”جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دوہ پئے تو مانگیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا بچہ اور نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسے بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ ملے کرو وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔“ (بقرہ: 233)۔

پھر اسلام یتیم بچوں کی عمومی فلاح کا ذکر کرتا ہے فرمایا:

”اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے
میں رشد کو پہنچ جائے۔“ (انعام: 152)۔

”قیموں کے مال ان کو واپس دو۔ اچھے مال کو بُرے سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے
ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔“ (نساء: 2)۔

”اور قیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل نہ ہو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان
کے اندر قابلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ جدا انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف
سے ان کے مال جلدی جلدی ہڑپ کر جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا سر پرست جو
مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے معاوضہ کھائے۔ پھر جب ان کے
مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو (یا درکھو) حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔“
(نساء: 6)۔

”اور تقسیم وراثت کے موقع پر کتبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی دو
اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے
بیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت ان کو اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس
چاہئے کہ وہ اللہ کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ قیموں کے مال کھاتے ہیں وہ در
حقیقت اپنے پینے آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جمو گے جائیں گے۔“
(نساء: 8-10)۔

”اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ قیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ
کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔“ (نساء: 127)۔

ان آیات و احادیث سے اندازہ لگائیں اسلام کی انسانیت پروری کا کمال سے ان بچوں کی فلاح و
بہبود کا کس قدر رُقر رہا ہے جو کسی طور والدین والد یا والدہ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جائیں۔ اس کے مقابلہ
میں آج ہمارے سامنے ان معاشروں کی بے زلفی، نیکی اور بد قسمتی کا حال دیکھیں جو جیتے جی اور ہستے ہستے اپنی

اولاد کو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے چلتا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ بھول اور ان کا یہ غیر فطری عمل بالانجام ان کے اور ان کی اولاد کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ کتنے معاشرے، کتنی بستیاں اور کتنے گھر آج اس لئے ویران پڑے ہیں کہ اولاد کو ان کے والدین نے غلطی سے بہانے اپنانے سے انکار کر رکھا ہے۔

یہ تو ہوئی صرف یتیموں کی بات لیکن کسی بھی معاشرے میں مائی طور پر کنزورر رشتے دار، مائی طور پر کنزور عوام، قیدی، مسافر، ہمسایہ وغیرہ جیسے پسماندہ و در ماندہ طبقات ہوتے ہیں۔ انسانی ضرورت ہے کہ ایسے تمام طبقات کی فلاح و بہبود کا بھی فکر کیا جائے۔ اسلام بطور انسانیت کا دین ان تمام طبقات کے دکھوں کا مٹاؤ بخود ادا کرتا ہے۔

پوری انسانی تاریخ پر اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین چونکہ اسلام ہی تھا اور ہے۔ یہود و نصاریٰ وغیرہ نے انحراف کرتے ہوئے اس کو مختلف نام دے دیئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ خود یہود کو ان طبقات کی فلاح و صلاح کی تاکید کی گئی۔ قرآن میں آیا:

”یا ذکروا اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ رشتے داروں کے ساتھ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا، اور زکوٰۃ دینا مگر تمھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔“ (بقرہ: 83)۔

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں اور یتیم کا سر پرست یتیم چاہے اس کا رشتہ دار ہو یا اجنبی جنت میں اس طرح ہونگے۔ آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتایا:“ (مسلم۔ موطا امام مالک)۔

”نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں کے گھروں میں سے بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جاتا ہو۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ بد سلوکی کی جاتی ہو۔“ (ابن ماجہ۔ مسند احمد)۔

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص تین یتیموں کی معاشی کفالت کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو رات کو قیام کرتا ہے اور دن میں روزے رکھتا ہے اور صبح و شام اللہ کی راہ میں نکواریں کرتا ہے۔ میں اور وہ

جنت میں دو انگلیوں کی طرح کھٹے ہو گئے۔“ (ابن ماجہ)

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکین کو کھانا کھلا۔“ (مشکوٰۃ)

قیموں کے علاوہ دوسرے محتاجوں کی فلاح و بہبود

جیسے کہ انسانی ضرورت ہے، اسلام صرف قیموں کی دیکھ بھال کا ذکر ہی نہیں کرتا اسے ہر اس فرد اور طبقے کی بھلائی و نوا کی فکر ہے جو کسی طور کمزور و نادار اور اس قابل نہ رہے کہ سلسلہ جسم و جاں اپنی کمائی سے کما حقہ قائم رکھ سکے۔ چنانچہ اسے پورے والدین کا بھی فکر ہے، غربت زدہ رشتے داروں کا بھی، قیدیوں کا بھی، مسافروں کا بھی، غرضیکہ ہر اہل حاجت کا۔ قرآن و سنت میں سے چند احکامات و ہدایات کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں:

”یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کو چھڑانے، قرضداروں کی مدد کرنے، اللہ کی راہ میں لگانے اور مسافروں کو آسانی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و مہیا ہے“ (توبہ: 60)۔

”یہ کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچہ و اخراجات اور (سچی و جہاد میں) کوئی وادی پار کریں اور ان کے حق میں سے لکھ نہ لیا جائے“ (توبہ: 121)۔

”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بجز نہ ہوگا“ (آل عمران: 92)۔

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے شرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی مازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، قیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی ربائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب مہد کریں تو

اسے وفا کریں اور تجلی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں مہر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں“ (بقرہ: 177)۔

”لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے“ (بقرہ: 215)۔

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیس نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے ہزاروں فی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں“ (بقرہ: 261-262)۔

”(خاص طور پر مدد کے مستحق وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسب معاش کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر واقعہ آدمی گمان کرنا ہے کہ یہ خوش مال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا“ (بقرہ: 273)۔

”درناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیٹانیاں اور پہلوؤں اور پٹٹیوں کو ڈانٹا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا“ (لوہ: 34-35)۔

یہ چند چیدہ چیدہ آیات اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ اندازہ لگائیں اسلام کے انسانیت کے دین ہونے کا کہ ایک طرف وہ چن چن کر ان محتاجوں کی نفاذ ہی کرتا ہے جو کسی نہ کسی طور مالی مدد کے مستحق قرار

پاتے ہیں تو دوسری طرف دولت مندوں کے لئے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ ان مستحقین کی مدد کریں۔ بالفاظ دیگر اسلام دولت مندوں کی دولت میں غرباء و مساکین وغیرہ کا حصہ اسی طرح فرض کرتا ہے جس طرح کہ وراثت میں حصہ داروں کا۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو ٹوک آیا ہے، فرمایا:

”انسان تھروڑا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو نکل کرنے لگتا ہے مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں“ (معارف: 19-26)۔

یہاں پر ایک اور انسانی ضرورت سامنے آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدد کئے جانے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اسلام کا طریق کار یہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ دینے والے براہ راست اپنی رقوم محتاجوں کو نہ دیں بلکہ وہ یہ رقوم بیت المال میں جمع کرائیں جس کی شاخوں کا پوری اسلامی دنیا میں جال بچھا ہو۔ یہ خلافت وقت کا کام ہے کہ وہ بیت المال سے وظائف کی شکل میں مقررہ مارج کو مستحقین تک مختص رقوم پہنچائے۔ یہ بھی کہ کھانا وغیرہ کی شکل میں اگر کوئی دولت مند کسی حاجت مند کی ضرورت کو براہ راست پورا کرتا ہے تو تاکید کر دی کہ وہ احسان جتانے اور بیکار لینے جیسی حرکات سے باز رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملاؤ جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر“ (بقرہ: 264)۔

یہ احسان کا جتنا اور اذیت دینا ہی گوارا نہ کیا، ایک مینھا بول اور ذرا سی چشم پوشی کو خیرات سے زیادہ احسن قرار دیا۔ فرمایا:

”ایک مینھا بول اور کسی مامگوار بات پر ذرا سی خاموشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بر دباری اس کی صفت ہے“ (بقرہ: 263)۔

اسلام ”ایک پتھ دو کات“ کے مصداق صدقہ کو بطور غارہ استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ

گناہوں کا بھی قلع قمع ہو اور غریب کی مدد بھی ہو۔ چنانچہ ارشادِ ربّ کا نکتہ ہے:

”تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو کوئی قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے غارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں“ (مانندہ: 45)۔

قسم توڑنے تک کا مادہ ”انفاق فی سبیل اللہ“ قرار دیا۔ فرمایا:

”تم لوگ جو مہمل قسمیں کھاتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر ضرورت سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) غارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے“ (مانندہ: 89)۔

انسان کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ بوقتِ ضرورت اسے قرض حاصل ہو لیکن وہ قرض جس میں سود کا عمل دخل ہو انسان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ لہذا اسلام نے سود کو دو ٹوک حرام قرار دیا۔ فرمایا:

”جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا غم نہیں مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے جتنا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ”تجارت بھی تو آخر سودی جیسی چیز ہے“ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سوکھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ (بقرہ: 275)۔

سود کی بجائے اللہ قرض کے لئے ایک حسن اصطلاحی ایجاد نہیں کرتا بلکہ اسے ”قرضِ حسنہ“ قرار دے کر یہ بھی قرار دیتا ہے کہ قرض دینے والا اللہ کو قرضِ حسنہ دیتا ہے جسے اللہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے۔

فرمایا:

”تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسد دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھ چاہے حاکم واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے“ (بقرہ: 245)۔

غریب و مساکین وغیرہ کی مالی اعانت کے لئے نبی کائنات ﷺ کی بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں۔ ہم طوالت سے بچنے کی خاطر ان احادیث میں سے صرف ایک حدیث کا تذکرہ یہاں پر کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے“ (بخاری و مسلم)۔

انسان کی دیگر ضروریات

انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔ وہ ہی اصل جانتا ہے کہ ضروریات کو کنسی ہیں اور ان کو پورا کیسے کرنا ہے۔ ہم چند ایسی ضروریات اور ان کے پورا کئے جانے کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

دھاندلی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت

دھاندلی اور زیرِ ابھیری سے خواہ مال حاصل کیا جائے، الیکشن جیتا جائے یا کوئی عہدہ وغیرہ حاصل کیا جائے کوئی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور اگر دیتا ہے تو وہ معاشرہ ایسا بیچ بوتا ہے کہ جو سویر یا بدیر اس کی تباہی پر بیچ بوتا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ عربی ہو یا عجمی کالا ہو یا گورا، عورت ہو یا مرد، بیوی ہو یا خاوند، شاہ ہو یا گدا، آجر ہو یا ایچہ کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ اس کا انجام بالآخر برا ہو۔ اسلام واضح اور دونوں طرف بدلیا مت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور تم لوگ نہ تو ایک دوسرے کے مال مارو طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے“ (بقرہ: 188)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، نہ کھو اپنے آپ کو خود قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے“ (نساء: 29)۔

ان آیات مبارکہ میں ایک بھیاں معاشرتی روگ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اگر اپنی چرب بانی سے یا جھوٹی گواہیاں بھگتا کر کوئی ایسی چیز حاصل کر لیتا ہے جو حقیقتاً اس کی نہیں تو وہ کئی معاشرتی بے ریلکیوں، بے اعتدالیوں اور دھاندلیوں کی نشو و نما کا ذریعہ بنتا ہے۔ پہلے یہ کہ وہ ایسا مال حاصل کرتا ہے جو اصل میں اس کا نہیں۔ پھر اس سبیل طریقے سے حاصل کردہ مال کو اگلے تلے اڑاتا ہے جو خود بڑی بے اعتدالی ہے۔ پھر جس شخص کا مال وہ حقیقتاً کھاتا ہے وہ بظاہر ہے وہ متغیر رہتا ہے اور کسی نہ کسی طور اس کا بدلہ لینے کے درپے ہوتا ہے۔ جتنے کسی معاشرے میں ایسے کیس ہو گئے اتنی ہی اس معاشرے میں کشیدگی، رس کشی اور جذبہ انتقام کا دور دورہ ہوگا۔ سب سے بڑا خسارہ یہ کہ جب دھاندلی سے بڑپ کرنے والا شخص اپنے رب کے پیش ہوگا تو ایک غامب کی حیثیت سے یعنی سزاوار سزا۔

کس قدر احسان اسلام کا اور کس قدر اس کی انسان پروری کا اس نے پہلے ہی قدم پر دھاندلی سے مال بڑپ کرنے کی ممانعت کر دی۔ بلکہ اس نے ایک قدم آگے اٹھایا، جب یہ فرمایا کہ ”جو کچھ اپنے لئے پسند کرو وہی دوسرے کے لئے پسند کرو“ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ دھاندلی ہو، کیسے وہ دھاندلی کرے گا کسی دوسرے سے؟

احسان کا طریقہ اختیار کرو

قرآن مجید میں آیا:

”احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے“ (بقرہ: 195)۔

یہ احسان کیا ہوتا ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ فرض کریں ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک کلو دودھ مانگا۔ دودھ کے مالک نے مانگنے والے کو ایک کلو دودھ بھی دیا اور ایک پاؤ اپنی طرف سے زائد دے دیا۔ اب یہ زائد کا دینا ایک بات تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دینے والے نے وہ کلو دودھ بھی بخوشی دیا، کسی جبر سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے مانگنے والے کے اس عمل کو برا نہیں جانا بلکہ اس کی قدر کی۔ یہی احسان ہے۔

اسے ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ایک تو ہے کہ کسی کام کا کرنا۔ ایسا کرنا محض کرنا بھی ہو سکتا ہے اور چاروا چار کرنا بھی۔ لیکن جب کرنے والا اس کام کو پوری دلچسپی، لگن اور خوبی سے کرے تو یہی احسان ہے۔ لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ یعنی انسان کی سرشت کو کاٹھ بھٹنے والے نے متنبہ بھی فرمایا کہ احسان کرنے والا اس حد تک آگے نہ جائے کہ وہ مائی طور پر خود کو نکال اور جسمانی طور پر اپنی صحت گنوا دے۔ چنانچہ مذکورہ آیت ہی کے پہلے حصے میں فرمایا:

”اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو“

آیہ مبارکہ کے اس حصے کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دین کی سر بلندی کی جدوجہد میں اگر تم خرچ نہ کرو گے تو یہ دنیا و آخرت دونوں میں بڑے خسارے کا سودا ہے۔ یعنی اس دنیا میں مفلو بیت اور آخرت میں مقدر ہو گا تو شدید ترین عذاب۔

اسلام کا کس قدر احسان اور اس کی کس قدر انسان پروری کی وہ دھاندلی والے معاشرے کی نفی کرنا ہے تو دوسری طرف ایسے معاشرے کو جو جو میں لانے کا داعی ہے کہ جو ”احسان“ پر مبنی ہو۔ یاد رہے اسلام تو مخالفین تک سے احسان کرنے اور انہیں معاف کرنے کا درس دیتا ہے۔ فرمایا:

”ان (مخالفین) کو معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ ان لوگوں کو پسند کرنا ہے جو احسان کی روش اختیار کرتے ہیں“ (امد: 13)۔

حق تلفی کی ممانعت

اسلام کی انسانیت پروری کا اندازہ اس سے لگائیں کہ آپ کو حقوق کی اس قسم کی تقسیم کہ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد اور (۳) حقوق النفس بدوں اسلام دنیا بھر کے لڑ پچڑ میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہ بھی اسلام ہی کا اعزاز ہے کہ حق تلفی خواہ اللہ کی ہو، بندوں کی ہو یا خود کسی انسان کی اپنے آپ سے اسلام اسے ظلم قرار دیتا ہے۔ حق تلفی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس کا حق ہوا سے تو ادا نہ کیا جائے اور اس کی بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا حق کسی اور کی طرف لوٹا دیا جائے اور ظاہر ہے ایسا کرنا ظلم ہی تو ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

1۔ حقوق اللہ

اسلام نے جیسے کہ ہونا چاہیے، حقوق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ بندوں کی طرف سے حقوق اللہ ادا کرنے کا مطلب ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو کما حقہ اسی طرح تسلیم کریں جیسے کہ وحی پر مبنی تعلیمات و ہدایات نے اس ہستی کا پتہ دیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں کہ جو کلیۃً اس کی ذات و صفات کا ہی پتہ دیتی ہیں۔ پھر کتاب اللہ کی بیشتر آیات اس کی صفات پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے ہم یہاں پر صرف تین مقامات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ آیت الکرسی میں فرمایا:

”اللہ وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اے اٹکھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت اور اک میں نہیں آ سکتی (۱) یہ کہ کسی چیز کا ظلم وہ خود ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی جمہورانی اس کے لئے کوئی تحکادینے والا کام نہیں ہے۔ پس وہی ایک بزرگ و بڑا ذات ہے“ (بقرہ: 255)۔

سورہ خلاص میں آیا:

”کہو! وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔“

سورہ شہد کی آخری تین آیات میں اس کی صفات کا ایک خوبصورت اور بھرپور گلدستہ آیا۔ فرمایا:

”وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا، وہی رحمن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سر اسر سلاطین، امن دینے والا، سب پر غالب، اپنا حکم بڑور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور

وہ ہی زیر دست اور حکیم ہے۔“

جو انسان اللہ کی ان ذات و صفات میں سے کسی ایک صفت کا سہواً حق ادا نہ کرے وہ گناہگار ہے اور جو کوئی عداوت کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو کوئی ان صفات میں اللہ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کو شامل کرے، وہ شرک ہے۔ یاد رہے وقت کے اس موڑ پر دنیا میں شرکین کی تعداد سب سے زیادہ ہے نہ ماننے والوں یعنی کافروں کی اس سے کم اور ماننے والوں یعنی ایمان لانے والوں کی سب سے کم۔

2۔ حقوق العباد

حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد یعنی بندوں پر بندوں کے حقوق کی باری آتی ہے۔ والدین کے اولاد پر حقوق ہیں تو اولاد کے والدین پر بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں تو شوہر کے بیوی پر امیر کے ماسور پر حقوق ہیں تو ماسور کے امیر پر۔ آجر کے اجیر پر حقوق ہیں تو اجیر کے آجر پر۔ استاد کے شاگرد پر حقوق ہیں تو شاگرد کے استاد پر۔ اسی طرح جیسے کہ ہم اوپر ذکر کر آئے، یتیم، مسکین، یتیم، مسافر یا قیدی وغیرہ سب کے حقوق ہیں۔ سخت گناہگار ہے وہ جو ان حقوق کی ادائیگی نہ کر پائے یا کوئی غفلت کا شکار ہو جائے۔

زمانہ قدیم سے لوگ بیٹیوں کو ایک بوجھ سمجھتے رہے ہیں ہم یہاں پر نمونے کے طور پر صرف ان احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو رسول ﷺ نے بیٹیوں کی فلاح و بہبود کے لئے بیان فرمائی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس شخص کے ہاں بیٹی ہو، وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور اسے ذلیل نہ کرے اور اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا“ (ابوداؤد)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے تین بیٹیوں کو پرورش کیا اور ان سے حسن سلوک کیا وہ جنت میں جائے گا“ (ابوداؤد)۔
اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تین سے کم ویش بیٹیوں والوں کے لئے یہ بٹا رت نہیں بلکہ مطلب محض بیٹیوں کا ہے خواہ ان کی تعداد کوئی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

”جس نے دو لڑکیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں، قیامت کے دن میں اور وہ اس

طرح آئیں گے۔ یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں اسٹھی کر لیں۔ (مسلم)۔

حضرت سراقہ بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ صدق کا بہترین مستحق کون ہے؟ وہ تمہاری بیٹی ہے جو (مطلقاً یا بیوہ

ہونے کے بعد) گھر میں واپس آ جاتی ہے۔“ (مشکوٰۃ، کتاب الآداب)۔

اسی طرح کی احادیث رشتے داروں اور دوسرے انسانوں کی خیر خواہی کے لئے ہیں۔ اسلام تو راستے میں پڑے پتھر کو ہٹانے والے کو صدقہ کی بشارت دیتا ہے۔ خدمتِ خلق کا وسیع دائرہ کار زیادہ تر حقوقِ اہلِ بادر کے متعلق ہے۔

3۔ حقوقِ انفس

انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ خود اپنے حقوق کی فکر کرے۔ اس کے جسم کا ہر عضو اس کے وقت کا ایک ایک لحوہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس کے پاس بطور امانت ہیں۔ وہ انہیں سب سے پہلے اپنی، پھر اپنے اعزہ و اقارب، پھر اپنے معاشرے اور بالآخر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود میں لگانا انویسٹ کرنے کا پابند ہے۔ جس قدر وہ اس سے انحراف کرے گا اسی قدر وہ خیانت کا مرتکب ہوگا۔ ایک مسلمان تو جنت کے عوض اپنا جان و مال فروخت کر چکا ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ جان و مال ہوتا تو اس ہی کے پاس ہے لیکن بطور ملکیت نہیں بطور امانت۔ قرآن مجید میں آیا:

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں“ (توبہ: 111)۔

ایسے میں جب ایک مسلمان خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے کسی دوسرے پر بعد میں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا گیا:

”اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا“ (طلاق: 1)۔

پھر یہ تصور امانت ایک انسان کے لئے اپنی ذات کے متعلق بھی ہے تو اجتماعی نظام کے متعلق بھی۔ ایک انسان اپنے اعضاء کو استعمال کرتے ہوئے وہی کام کرتا ہے جس کے لئے اسے یہ عطا کئے گئے ہیں تو

درست بصورت دیگر خیانت ہے اور کامل گرفت۔ خودکشی اسی لئے حرام ہے کہ یہ اپنے نفس پر ظلم ہے۔ قرآن مجید یہ واضح تصور پیش کرتا ہے کہ جب بھی کوئی فرد بھلائی کا کام کرتا ہے تو اس بھلائی کا فائدہ خواہ کسی دوسرے کو پہنچے یا نہ پہنچے، اس کی اپنی ذات کو ضرور پہنچتا ہے اور اسی طرح کوئی برائی کرے تو اس برائی کا نقصان کسی دوسرے کو پہنچے یا نہ پہنچے، خود اس کو ضرور پہنچتا ہے۔ فرمایا گیا:

”جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ (قیامت کو) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ (بنی اسرائیل: 15)۔

پھر قرآن یہ بھی پتہ دیتا ہے کہ جو کوئی صرف اپنی اس دنیا کو ہی بنانے میں لگا رہے تو اسے اس کا معاوضہ اس دنیا میں ادا کر دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں۔ اور جس کی دوزخ و جہنم اپنی آخرت سنوارنے کے لئے ہو تو ایسا شخص بشرطیکہ وہ مومن ہو آخرت میں انعامات پائے گا۔ فرمایا:

”جو کوئی جلد (سامنے کی دنیا) کا خواہشمند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی دینا چاہیں پھر اس کے حصے میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہئے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی“ (بنی اسرائیل: 18-19)۔

انسان کی خیر خواہی و بھلائی اسی میں ہے کہ نہ تو نخل کا شکار ہو اور نہ اللہ کی راہ میں بھی اتنا خرچ کر دے کہ خود نکال ہو جائے۔ یعنی اخراجات کرتے وقت اسے اپنی ذات کو نہ بھول جانا چاہئے۔ اپنے نفس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔ قرآن کریم نے اسے استعارے کی زبان میں یوں بیان کیا ہے:

”نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو (نخل کرو) اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو (استطاعت سے زیادہ خرچ کرو) کہ خود ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ“ (بنی اسرائیل: 29)۔

عبادت کتنا محبوب عمل ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک نابھ خود پر اتنا بوجھ نہ لادے کہ اس کی ذات کا نقصان ہو۔ ملاحظہ ہو نئی کائنات

ﷺ کا اس بارے میں ارشاد:

”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ”اے عبداللہ! مجھ کو کچھ دی گئی ہے کہ تو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو (مسلل) عبادت کرتا ہے“ میں نے عرض کیا ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ“ آپ ﷺ نے فرمایا ”ایسا نہ کرو۔ روزہ بھی رکھا اور روزہ ترک بھی کر۔ رات کو عبادت بھی کر اور سو بھی۔ اس لئے کہ تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے“ (بخاری و مسلم)۔

بنیادی حقوق

خالق کائنات نے اپنی مکرم مخلوق یعنی انسان کو معاشرت پسند بنایا ہے۔ معاشرے کے بغیر وہ اپنی ہستی تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ماں کے پیٹ کے اندر ہونے سے لیکر اس دنیا میں آخری سانس تک اسے بے شمار افراد کی خدمات کی محتاجی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پرورش اور تربیت کے دوسرے لوازم بشمل خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، علاج وغیرہ کے لئے ہی نہیں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کی نشو و نما کے لئے وہ لازماً اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اعزہ و اقارب کی ایک خاصی بڑی تعداد اور مختلف النوع شہریوں کی فوج ظفر موج اس کے حقوق و فرائض کو متعین کرتی ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے حقوق کی تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ جن کی حیثیت اخلاقی ہوتی ہے۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، کمزور کی مدد، واقف یا ماواقف ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا وغیرہ۔ دوسرے وہ حقوق ہیں جن میں قانون داخل ہوتا ہے۔ ایسے حقوق کی مزید دو اقسام ہیں۔ ایک قسم وہ جو شہریوں کے مابین ہوتے ہیں جیسے حق نکاح و طلاق، حق مہر، حق اجرت، حق پردہ داری، حق راز داری وغیرہ۔ دوسری قسم حقوق کی وہ ہے جو حکومت وقت اور شہریوں کے مابین ہوتی ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم اخلاقی اور شہریوں کے مابین قانونی حقوق پر کافی بحث کر چکے۔ ذیل میں ہم ان حقوق کا ذکر کرتے ہیں جو شہریوں اور حکمرانوں کے مابین ہوتے ہیں۔ اس میں اندرونی یا بیرونی دونوں قسم کے حکمران شامل ہیں۔

حق ملکیت

اسلام کا یہ منفرد کردار کہ وہ انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ ضرورت سے زائد تو وہ اپنے قبضہ

میں نہیں رکھ سکتا لیکن ضرورت ہو یعنی اگر وہ ضروریات زندگی پیدا کرنے کی خاطر قیصریوں اور لمبے چوڑے کاروباروں میں مصروف ہو تو ارب پتی بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی آمدنی و اخراجات قرآن و سنت کے مطابق ہوں اور یہ بھی کہ اس کے کاروبار سے حکومت یا کسی دوسرے شخص کے کاروبار پر برا اثر نہ پڑتا ہو۔ پھر جیسے کہ انسانی ضرورت ہے اسلام حق ملکیت مرد اور عورت دونوں کو دیتا ہے۔ اسلام کی انسان پروری کی یہ بھی ایک روشن مثال کہ وہ وراثت میں مرد اور عورت، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو شامل کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو خواہ چھوڑا ہو یا بہت، حصہ ہے ضرور“ (نساء: 7)۔

اس آیت مبارکہ میں موجودہ دور کی کئی الجھنیں حل کی گئی ہیں۔ پہلی الجھن جس کا حل بتلایا گیا ہے یہ کہ عورت خواہ وہ بیٹی، بہن، بیوی، ماں یا کسی حیثیت میں ہو اس کی ایک اپنی حیثیت (Identity) ہے۔ وہ محض دوسروں پر بوجھ (Dependent) نہیں اور بے سہارا نہیں ہے۔ مرد کی طرح وہ حامل ملکیت ہے اور فرض ہونے پر اسے اپنی ملکیت سے زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔ دوسری اس الجھن کا حل کہ میراث کو بہر حال تقسیم ہونا چاہو اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف وارثین کے حصوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ذمہ داریوں کے مطابق طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مرنے والے نے اگر ایک پلاٹ چھوڑا جس کے دس وارث ہیں تو یہ تو ضرور ہے کہ اسے دس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ دس حصے برابر ہوں بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کے مطابق کم و بیش ہونگے جو مختلف وارثین نے ادا کرنی ہیں۔ مثال کے طور پر مرد پر تو لواحقین کے مان و نفقہ کا بوجھ ہوتا ہے، عورت پر نہیں۔ پھر یہ بھی کہ عورت کو میسے سے بھی وراثت ملتی ہے تو سسرال سے بھی۔ پھر اس مسئلے کا حل بھی اس آیت میں موجود ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و املاک پر ہوگا خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، صنعتی ہو یا زرعی وغیرہ۔ پھر یہ تو ظاہر ہے ہی کہ تقسیم وراثت کا مسئلہ پیدا ہوگا تو اس وقت جب مرنے والا کوئی مال و ملکیت چھوڑ کر مرا ہو۔

اسلام نے تحفظ و حق ملکیت کو اس قدر اہم قرار دیا ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے“ (بخاری)۔

مال کا اصل تحفظ جس کی اسلام بار بار تاکید کرتا ہے اسکا اللہ کے لئے خرچ کرنا ہے۔ وہ مال جو اللہ کی راہ میں یا دوسرے نیکوں میں ان مدات میں جو انسانیت کی خیر خواہی کے لئے ہوں خرچ کیا جائے وہ ایسے بنگ میں جمع ہو جاتا ہے جہاں نہ چور کا ڈر ہے نہ خسارے کا بلکہ وہاں ہر جمع کیا جانے والا سرمایہ کئی گنا بڑھا کر واپس کیا جاتا ہے۔ (بقرہ: 261)۔

پھر اسلام کا یہ بھی اعزاز کہ سرمائے و مال پر سانپ بن کر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی صورت میں ایسا فطری نظام دیتا ہے کہ سرمایہ فطری انداز سے گردش میں رہتا ہے۔ بڑی بھیا تک و عمید بہانہ مالداروں کے لئے جو مال اندوزی کرتے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے فرمایا:

”درناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دیکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیٹانیوں، پہلوؤں اور ہاتھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سستی ہوئی دولت کا مزہ چکھو“ (توبہ: 34-35)۔

یہ بھی اسلام کا اعزاز کہ وہ مال و متاع کو بچا و بچا بننے کی اجازت نہیں دیتا، وہ تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیتا ہے۔ ایمان، عمل، علم اور صحت جسم کی قدر کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”ان کے نبی نے ان سے کہا اللہ نے طاقت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسم کی اہلیتوں سے نوازا ہے“ (بقرہ: 247)۔

یہ ہے اسلام! وہ جو اسلام کی مخالفت کرتے ہیں کیا وہ مرد کے ساتھ عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتے؟ ذرا تہائی میں سوچیں تو سہی، آخر انسانیت کی وہ کیا خدمت کر رہے ہیں؟

حقوقی جاں

اسلام انسانی جان کو اس قدر محترم قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اور ایسا قتل صرف مسلمان کا ہی نہیں، مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کا۔ قرآن مجید میں آیا:

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے لیا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی“ (مائدہ: 32)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا:

”قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، ایسا کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ“ (نہی اسرائیل: 32)۔

انسانی ضرورت ہے کہ بعض صورتوں میں کسی انسان کی جان لینا معاشرے اور بہتر رہن سہن کی ضرورت بن جاتی ہے۔ اسلام نے ان صورتوں کی وضاحت کر دی ہے اور ان کو درج ذیل چھ صورتوں تک محدود کر دیا ہے۔

- 1- قتل عمد کے مجرم سے قصاص
 - 2- جہاد میں دس حق کی راہ میں مزاحم لوگوں سے جنگ۔
 - 3- اسلامی نظام حکومت کو اپنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔
 - 4- شادی شدہ عورت یا مرد کو زنا کی سزا۔
 - 5- ارتداد کی سزا۔
 - 6- شاہراہوں پر ڈاکوئی کرنیوالوں کو سزا
- قتل عمد کی سزا لازماً جہنم رسیدگی ہے۔ قرآن مجید میں آیا:
- ”وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے“ (نساء: 93)۔
- اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ سیکولر نظاموں کے قوانین تحفظ جان کے حق کو بعد از ولادت لاگو کرتے ہیں

اس کے برعکس اسلام اس حق کا اطلاق اس وقت سے کرتا ہے جب ماں کے پیٹ میں لوتھڑا انسان فی مثل اختیار کرتا ہے اور اس کی مدت اسلام نے مستقر اجل سے چار ماہ بعد رکھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے نہ صرف زنا کا اعتراف کیا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا۔ بادی برحق ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ حاملہ تو نہیں؟ اس کے اقرار پر اس کی سزا کو نہ صرف بچے کی ولادت تک مؤخر کیا بلکہ رضاعت تک یعنی بچے کی دودھ پینے کی مدت تک جسے بھی اسلام نے دو سال کی مدت سے مختص کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی حرمتِ جاں پر مصر ہیں۔ چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے:

جیہ اللہ! ع پر آپ ﷺ نے ناکید کی فرمایا:

”لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئی ہیں۔ ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ایسی ہے جیسی آج تمہارے اس دن کی اس ماہ مبارک (ذی الحجہ) کی اور اس شہر کی۔ خبردار! یہاں نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور کفار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ (بخاری، بوداؤد)۔

”کسی مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں پوری دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا (مسلم)“ اور خونِ عرفِ مسلمان کا ہی محترم نہیں اللہ کے ہر بندے کا خون محترم ہے۔ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر کسی ذمی کا قتل ماحق ہو جائے تو اس پر جہنم حرام ہے۔ فرمایا:

”جس نے کسی معاہدہ (وہ جس کے ساتھ معاہدہ ہو) غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جہنم کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا“ (بخاری)۔

اس موضوع پر اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن ہم ایک اور حکم بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ فرمایا:

”اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو“ (نساء: 29)۔

یعنی اسلام خودکشی کو حرام قرار دیتا ہے۔ یوں خودکشی کا دروازہ اس نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ یہ ہے اسلام! اسلام کے مخالفین کیا قتلِ انسانی کے اس قدر متوازن، مبربوط اور با مقصد نظام کو نہیں چاہتے؟ ذرا تہنائی میں سوچیں وہ انسانیت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں؟

اسلام کے نزدیک کسی پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا تقریباً اتنا ہی بڑا مجرم ہے کہ جتنا زانیہ زانیہ۔ غیر شادی شدہ زانیہ اور زانیہ کی سزا اگر سو کوڑے ہے تو تہمت لگانا اس کا ثبوت پیش نہ کرنے والے کی سزا ہی کوڑے ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو“ (نور: 4)۔

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو حقیر جانا جائے۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں نہ عورتیں ہو ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (حجرات: 11)۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے پر طعن کی جائے یا ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو“ (حجرات: 11)۔

بدزبانی اور شہد پن میں مام پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا:

”ایمان لانے کے بعد فسق و فجور میں مام پیدا نہ کرو۔ یہ بُری عادت ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں“ (حجرات: 11)۔

کس قدر کمال اسلام کا ہدگمانی، تجسس کرنے اور غیبت وغیرہ کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا تو بہ قول کرنے والا اور رحیم

ہے“ (حجرات: 12)۔

خون رنگ نسل زبان وجہ فضیلت نہیں۔ اللہ کے نزدیک افضل و اعلیٰ وہ ہے جو اس سے ڈرنے والا ہے۔ وہ اتنا ہی اللہ کے نزدیک جتنا تقویٰ میں زیادہ۔ قرآن میں آیا:

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (حجرات: 13)۔

کچھ لوگ عزت حاصل کرنے کی خاطر کسی اونچی کھٹی والے کسی اونچے مہدے والے کسی اونچی مسند والے کام چھلانے کی سعی کرتے ہیں۔ برعم خویش وہ کسی بلند منصب سے منسلک ہو کر اپنی عزت و بڑائی کے مستاشی ہوتے ہیں۔ یوں معزز ہونے والے اصل میں خود کو معزز بنانے کی دھن میں ذلت و رسوائی کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید پتہ دیتا ہے کہ یوں عزت گنوانے والے سن لیں کہ عزت کا سرچشمہ تو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔ عزت بھی اسی ایک کے ہاتھ میں ہے تو ذلت بھی۔ قرآن میں آیا:

”کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران: 26)۔

اور یہ بھی آیا:

”اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ خردہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے“ (نساء: 139)۔

اسلام نے امیر اور غریب کے مابین فرق کو کم کرنے اور روپے پیسے کو سرکولیشن میں رکھنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام اپنا رکھا ہے بلکہ اسے ایک عبادت قرار دیا ہے۔ اس نظام میں سرمائے کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف

ہوتا ہے لیکن انتقال مال کا یہ براہ راست یعنی ایک آدمی سے بالمشافہ دوسرے کی طرف نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنی رقم سرکاری خزانے یعنی بیت المال میں جمع کراتا ہے اور وہاں سے رقوم مستحقین کو بطور وظائف ادا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے براہ راست ادائیگی کی صورت میں زکوٰۃ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے جو اسلام کو قطعاً گوارا نہیں۔ ہاں کسی وقت ایمر جنسی میں کوئی صاحب مال اپنا مال کسی غریب کے سپرد کرے تو اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا ثواب احسان جتلا کر اور اذیت دے کر کم نہ کرے۔ فرمایا:

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتلاتے نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک مینھا بول اور کسی ماگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے“ (بخاری: 263-262)۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے تحفظ کی تاکید میں ہیں۔ چند ایک کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔ فرمایا:

”مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پائی نہیں ہونی چاہئے) اور یہ کہ اس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔ جس نے بلا وجہ کسی مسلمان کو مارا، اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا“ (طبرانی)۔

”مگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرنا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا ہے جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عز و جل اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے“ (داؤد)۔

”بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا ہے“ (داؤد)۔

”جس کسی نے دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو تو وہ آج معاف کرالے اس دن سے پہلے جب نہ روپیہ پیسہ ہو گا نہ مال و زر، البتہ نیک عمل اس کے پاس ہو گا جو لے لیا جائے گا اس ظلم کے موافق۔ اور اگر

نیک عمل نہ ہو گا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی۔“ (بخاری)۔

یہ بجا سلام! انسان و انسانیت کا محافظ! کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسا تحفظ نہیں چاہئے؟
جبائی میں ذرا وہ سوچیں کہ وہ انسانیت کی کیا خدمت کر رہے ہیں؟

نجی زندگی کا تحفظ

نجی زندگی کے تحفظ کا کما حقہ انتظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ مرد اور عورت کے درمیان اس تقسیم کار کو مد نظر نہ رکھا جائے جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اسلام عورت کے دائرہ کار کو اس مملکت میں محدود کرتا ہے جس کا نام ”گھر“ ہے۔ یہ وہ گھر جو مختلف نوع کی ذمہ داریاں ہیں وہ مرد کے سپرد کی گئی ہیں۔ دائرہ کار کی اس تقسیم میں غیر معمولی حالات میں تھوڑے بہت انحراف کی اجازت ہے۔ عام حالات میں قطعاً نہیں۔ آج کی دنیا میں بہت سے معاشروں نے اللہ تعالیٰ کی طے کردہ اس فطری تقسیم کار سے انحراف کر کے پشیم سرد کیچ لیا ہے کہ انہوں نے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ماری ہے۔ گھروں میں رہنے والے مرد بے راہ ہو گئے۔ مرنے دینے پر ایک دوسرے سے رابطے ٹوٹ گئے۔ شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر پر اعتماد نہ رہا۔ اطمینان قلب جیسی سب اقدار گنوا بیٹھیں۔ آجاکرتوں اور بلیوں سے دل بہلانے لگے۔ ایسے میں نجی زندگی خود کہیں نہیں اس کے تحفظ کا کیا سوال؟

اسلام اس فطری تقسیم کار کو لے کر نجی زندگی کے تحفظ کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ آئیں دیکھیں کیسے؟
اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر جاؤ تو وہاں داخل ہونے سے پہلے اہل خانہ سے اجازت لو اور ان پر سلام بھیجو۔ قرآن مجید میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضائے لو اور داخل خانہ پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں پر کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔“ (نور: 27-28)۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ کسی کے گھر دستک دینے کے بعد اس کے باہر آنے تک

کے انتظار میں دروازے کے سامنے کھڑا ہونے کی بجائے اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا چاہئے۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بھی آواز یاد رکھو۔ دے کر داخل ہوا جائے تاکہ ماں، بہنوں اور بیٹیوں پر ایسی حالت میں نظر نہ پڑے کہ خفت کا باعث ہو۔

ان۔ کانوں، دکانوں، فستروں وغیرہ کو ایسی پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا جہاں رہائش نہ ہو۔ فرمایا:

”تمہارے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو“ (نور: 29)۔

کسی دوسرے کے گھر داخل ہونے کی اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پھر وہاں دھرم دے کر بیٹھ جائے۔ احسن یہ ہے کہ وہاں بقدر ضرورت وقت گزارنے کے بعد فوراً اٹھ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ صاحب خانہ وقت محسوس کرے۔ بالخصوص نبی رحمت ﷺ کے گھر کے حوالے سے فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو“ (احزاب: 53)۔

یہ بھی اسلام کی ہدایت ہے کہ اگر دروازے سے ہی کوئی چیز لینی ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ فرمایا:

”نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو“ (احزاب: 53)۔

انسان کی ایک اور ضرورت ہے کہ استراحت کے اوقات میں اس کی پرانیوں میں کوئی ظلل انداز نہ ہو۔ اسلام نے اس معاملے کو بھی ہاتھ میں لیا ہے۔ فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لازم ہے کہ تمہارے مملوک (نوکر، لونڈی وغیرہ) اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں، تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔ صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تمہیں ایک دوسرے کے

پاس بار بار آتا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے اور وہ عظیم و حکیم ہے۔ (نور: 58)۔

آج کے دور میں حکومتی سطح پر بہت سے ایجنسیاں ایسی ہیں جو شہریوں کی ٹوہ اور تجسس میں لگی رہتی ہیں۔ اسلام یہ خواہ خواہ کا جاسوسی کا جال بچانے، کسی شہری کے پیچھے خبر لگانے، لوگوں کے گھروں میں آلاسنے جاسوسی نصب کرنے، ٹیلیفون ٹیپ کرنے، خطوط منسٹر کرنے اور یوں مخالفین کو بلیک میل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے“ (حجرات: 12)۔

رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا کہ اگر تم تجسس کے درپے ہو گے تو لوگوں کو بگاڑ دو گے۔ ملاحظہ ہو آپ کا ارشاد مبارک:

”تم اگر لوگوں کے مخفی حالات، علوم کرنے کے درپے ہو گے تو ان کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے“ (ابوداؤد)۔

حکمرانوں کی طرف سے آج مختلف معاشروں میں ایسے بگاڑ کی شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک اور حدیث میں آیا:

”جس نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ ہر دیا“ (ابوداؤد نسائی)۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

اگر کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

آپ ﷺ نے کسی کا خط پڑھنے کی بھی ممانعت کی۔

یہ جہاں اسلام! کیا اسلام پر یلغار کرنے والوں کو گھر والوں کو بیرونی مداخلت سے بچانے، راز ٹٹولنے، کھوج لگانے سے پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا تجاہلی میں غور فرمائیں وہ انسانیت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں؟

حق آزادی

اس موضوع پر ہم دو ذیلی عنوانات کے تحت بحث کرتے ہیں۔ یعنی آزادی عمل اور آزادی رائے۔

1۔ آزادی عمل: آج کی دنیا میں خواہ وہ مسلم دنیا ہو یا غیر مسلم ایک شخص بھی آزاد نہیں۔

انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔ جس طرح ایک عام فیکٹری کے پروڈکٹ والے کو اپنی تیار کردہ چیز کو استعمال میں لانے کی ہدایات دینی ہوتی ہے اسی طرح نظریات کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کو زندگی گزارنے کے قوانین و ضوابط دینا صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری انسانی تاریخ پر وقتاً فوقتاً آسمانی کتابیں مازل فرمائی ہیں۔ لیکن دنیا بھر میں ایک انسان بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو ایسے نظام زندگی میں رہے جس رہا ہو جو خالص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین پر مبنی ہو۔ اس لئے کہ ایسا نظام خود کسی خطہ زمین میں نافذ نہیں۔ دنیا بھر میں دو طرح کے نظام رواں دواں ہیں یعنی یا تو وہ جو خالص بندوں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں جیسے آمریت، جمہوریت یا اشتراکیت وغیرہ اور یا نظام ایسے قوانین پر مبنی ہیں جو کچھ اللہ کے قوانین پر اور کچھ بندوں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں یعنی ان کی حیثیت مغلوبہ کی ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے قوانین تو ظاہر ہے آزادی کو یقینی بناتے ہیں اس لئے کہ وہ اس ہستی کے بنے ہیں جو غیر جانبدار ہے جس کا نظام کے ساتھ کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ نہ اس کی اولاد ہے نہ برادری۔ اس کے مقابلہ میں جہاں بھی بندوں سے قانون سازی کا عنصر آکھتا ہے وہیں انسانوں اور انسانی طبقات کا مفاد چپکے چپکے یا بانگِ دہل آشمل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب آج کی دنیا میں خالص اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام رائج نہیں تو کسی نہ کسی طور دنیا کا ہر شخص محکوم ہے۔ الٹی قوانین اور انسانی قوانین کی نسبت تناسب کے مطابق کہیں افراد تھوڑے جکڑے ہوئے ہیں کہیں بہت لیکن ہیں ہر جگہ پر محکوم۔

محکوم ہونے کا جو سب سے زیادہ نقصان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آزادی عمل کی نعمت سے نوازا رکھا ہے وہ چھینی جاتی ہے اور کوئی بھی فرد ان صوابدیدی اختیارات (Discretionary powers) سے استفادہ نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کی آزمائش کے لئے وضع اور عطا کر رکھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام ہو تو انسانیت اس سہولت سے فائدہ مند ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

اسلام ان صوابدیدی اختیارات کا بدرجہ اتم تحفظ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:
 ”دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے علیحدہ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے“
 (بقرہ: 256)۔

اور کون اس آزادی پر دھوا بول سکتا ہے جب کہ کسی نبی کو بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں۔ قرآن میں
 آیا:

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے
 کہ اللہ کی بجائے تم میرے محکم بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (اللہ کے محکم) بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا
 تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو“ (آل عمران: 79)۔

خود رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:
 ”اے نبی ﷺ! نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، ان پر جبر کرنے والے نہیں“
 (ناشیہ: 21-22)۔

عمل کی یہ آزادی کوئی مادر پدر آزادی نہیں۔ اس پر ایک بڑی قدغن ہے اور وہ قدغن یہ کہ عمل فرد سے
 ہو یا اجتماعی طور پر کسی ادارے حتیٰ کہ پوری ملت مسلمہ سے یا اسلام کے کسی ضابطے، چھوٹا ہوا بڑا، کے خلاف نہ
 ہو۔ یہ قدغن یا پابندی اسی نوعیت کی ہے جیسے بائی وے پر لگے ہدایتی اشارات جن کا مقصد مسافر کے سفر کو نقص
 محفوظ بنانا ہوتا ہے۔ عمل سفر پر ناجائز پابندی لگانا نہیں۔

2۔ آزادی رائے: کوئی بھی معاشرہ، کوئی بھی گروہ تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف
 بڑھتا ہے جب اس کی زبان، قلم پر تالے لگا دیئے جائیں۔ اس لئے اسلام دو بڑے اداروں یا منسٹیروں کو
 آزادی رائے اظہار آزادی رائے اور مشاورت کے لئے مختص کرنے کو لازم قرار دیتا ہے۔ یہ قرآنی تقاضا ہے
 یعنی ان کے وجود کی خود قرآن میں باعرا رکید کی گئی ہے۔ یہ دو ادارے ہیں:

(i) شورائی

(ii) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ہم ان کی اہمیت اور طریق کار پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔

(i) - شورعی: اسلام ایک شورائی نظام ہے یعنی یہ نظام لوگوں کے مشورے سے چلایا جاتا ہے۔

قرآن میں آیا

” (جو کچھ اللہ کے پاس ہے) وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ رزق انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں“ (شوری: 37-38)۔

اسلام میں پارلیمنٹ کی بجائے شورعی کا ادارہ ہوتا ہے۔ شورعی کا ادارہ اصل میں مجتہدین کا گروہ ہوتا ہے یعنی ایسے لوگ جن کا قرآن و سنت پر بھی مکمل عبور ہوتا ہے تو حالات حاضرہ پر بھی۔ انہوں نے ہر اس معاملے میں قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلہ کر کے خلیفۃ المسلمین کو اپنی رائے اور مشورے سے نوازا ہوتا ہے جس کے متعلق قرآن و سنت میں براہ راست نص یا کوئی ضابطہ نہ ہو۔ اسلام کی یہ عظمت کہ اس نے رائے اور مشورے کو حکمرانی حیثیت میں (Institutionalize) کر دیا ہے۔

خلیفۃ المسلمین پوری اسلامی دنیا کا واحد سربراہ و ناظرِ علوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا آمر ہوگا۔ لیکن وہ اتنا بے بس کہ کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔ وہ قرآن و سنت کے احکامات کا پابند ہے خواہ ان کا اطلاق خود اس پر، اس کے بچوں اور دیگر اعزہ و اقارب پر ہو۔ ہاں، ایک شکل ایسی پیدا ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو کہ جس کے متعلق قرآن و سنت میں براہ راست کوئی ضابطہ نہ ملے۔ ایسے میں بھی خلیفۃ المسلمین بغیر شورعی کا مشورہ اور رائے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وہ صورت حال ہے کہ جہاں شورعی اور مشورے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہر رکب شورعی مشورہ دینے میں کلی آزاد ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی رائے کا اخذ اس کی اپنی مرضی نہیں، قرآن و سنت ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں نبی ﷺ کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ عوام سے مشورہ کرے، ظاہر ہے

ایسا مشورہ کا رسالت میں نہیں کار خلافت میں درکار ہوتا ہے۔

(ii)۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر: ایک اچھے معاشرے کی علامت یہ ہے کہ وہاں نیکی کو فروغ تو برائی کا قلع قمع ہو۔ اس کے برعکس اگر کسی معاشرے میں معاملات ہو یعنی جہاں برائی کو فروغ اور نیکی کا قلع قمع ہو تو وہ معاشرہ آج گرایا کل، بس تباہی کی طرف گامزن ہونے کی وجہ سے جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اسلام ایک ایک فرد، ایک ایک اور باآخر پوری امت کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ نیکی کو فروغ اور برائی کا انسداد کرے۔ ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جہاں برائی ہو رہی ہو دیکھنے والا اسے روکے اور جہاں نیکی ہو رہی ہو اس کا معاون بنے۔ یعنی دیکھنے والا محض تماشا نہ بنے۔ بھلائی دیکھے یا برائی اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے۔ مسلمان سوسائٹی کا فرد یا ادارہ ہوتے ہوئے ایسا کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ رائے کے اظہار کے لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کسی طور نگران اور کنٹرانی کی پوزیشن میں ہے تو اپنی رائے کو برومانڈ کرے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں تنگی محسوس کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”جو شخص برائی کو دیکھے تو اسے طاقت سے بدل ڈالے، اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر زبان سے (اس کے خلاف) جہاد کرے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر کم از کم اپنے دل میں ہی اس سے نفرت کرے اور یہ آخری کیفیت کمزور ایمان کی نشانی ہے“ (مسلم ہرذی)۔

فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اتکا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں فرماتا جو یہ فرض منصبی ادا کرنے سے کاصر رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے امت مسلمہ!) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) مذاب میں مبتلا کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کے لئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا“ (ترمذی، منہاج احمد)۔ چونکہ یہ رائے دینا ایک دینی فریضہ ہے اس لئے اسلامی تاریخ میں بسا اوقات ایک عام شہری خلیفہ المسلمین کا حساب تک کر سکتا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پراؤ

ڈالیں۔ ایک صحابی نے دریافت کیا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ذاتی رائے ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا ”پھر تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہوگی۔“ چنانچہ اسی کی رائے پر عمل کیا گیا۔ (یہ رائے لینا خلافت کا حصہ تقاریر و رسالت کے معاملہ میں کسی رائے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اللہ اور رسول ﷺ کا معاملہ ہے۔)

ایک خاتون راہ چلتے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ پر برس پڑیں اور بولیں ”عمر تمہارے حال پر افسوس ہے میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عمر کھلاتے تھے اور لالچی لئے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمر کھلانے لگے اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ رعایا کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا اور آخرت کے بعد عالم سے اپنے آپ کو بالکل قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہو گا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہے گا کہ اللہ کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ جائے۔“

یہ ہے اسلام! پوری انسانی تاریخ میں آزادی عمل، آزادی اظہار رائے، اظہار ضمیر و اعتقاد کے ایسے مناظر اب نہیں ملیں گے۔ کیا مخالفین اسلام کو ایسی آزادی کی ضرورت نہیں؟ تنہائی میں ذرا سوچیں اسلام پر یلغار کر کے وہ انسانیت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں؟

ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

ظلم کا متبادل مفہوم حق تلفی ہے۔ حق تلفی خواہ کسی فرد کے خلاف ہو، خود کسی کے اپنے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کے خلاف ہو، ظلم ہے۔ شرک کو اسی لئے ”ظلم عظیم“ کہا گیا ہے کہ اس میں وہ اوصاف و اعزازات جو صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہیں کسی دوسرے میں بھی گردانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر حاکمیت و قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ کے مازل کردہ قوانین کو نافذ نہ کریں جس کا دوسرا مطلب ہے کہ وہ خود ساختہ قوانین نافذ کریں تو ایسوں کو کافر بھی کہا گیا ہے، ظالم بھی اور فاسق بھی۔ (مانندہ: 44، 45، 47)۔ بنامہ قرآن مجید میں کئی مقالات پر گناہ کے لئے ظلم اور گناہگار کے لئے ظالم کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں بار بار صرف یہی نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پابند کرتا ہے (آل

عمران: (57) بلکہ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا (مانندہ: 52) صرف مظلوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ محض احتجاج تو کیا بدگلائی کی اجازت دیتا ہے۔ فرمایا:

”اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، (۱) یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے“ (نساء: 148)۔

حدیث میں آیا:

”مفضل ترین جہاد اس شخص کا ہے جو کسی حق سے بے ہوش ہوئے سلطان کے آگے کلمہ حق کہے“ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

یہ بھی فرمایا:

”لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو پچیدہ نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام مازل کر دے“ (ابوداؤد، ترمذی)۔

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد مبارک ہے:

”اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کریں گے مگر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ فرمایا: اسے ظلم سے روکو دو“ (بخاری)۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے بھری محفل میں سخت گلائی کی۔ اس کے گستاخانہ طرزِ مخاطب پر صحابہؓ چونک گئے اور وہ اس کی حرمت کے لئے اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے کہنے دو، اے کہنے دو، جس کا کچھ حق نکلتا ہو وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے“ (بخاری)۔

یہ ہے اسلام! ظلم کے خلاف احتجاج کو نہ صرف حق بلکہ فرض قرار دیتا ہے۔ اسلام پر یلغار کرنے والے سوچیں کہ اسلام پر یلغار کیا انسانیت پر یلغار نہیں؟

عمل غیر سے برأت

آج کی سیکولر اور جمہوری دنیا میں رواج ہے کہ اگر مجرم ادھر ادھر چھپ جائے تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے تاکہ کسی طور مجرم دستیاب ہو جائے۔ اسلام اس کی سختی سے

تردید کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا“
(انعام: 164)۔

ایک اور جگہ پڑھایا:

”سمجھ لو ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں“ (ہجرہ: 193)۔

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی اور۔ یہ وہی ضابطہ ہے جو قیامت کے دن بروئے کار لایا جائے گا۔ چنانچہ قرآن میں یہ بھی آیا:

”جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال ہی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ (نہی اسرائیل: 15)۔
جب یوسف نے اپنے بھائی کی خرابی سے اپنا گم شدہ پیالہ برآمد کر لیا تو اس کے بھائیوں نے یوسف سے استدعا کی کہ اس بھائی کی بجائے کسی اور کو مجبوس کر لیا جائے لیکن یوسف نے یہاں اسی ضابطے کی وضاحت کی۔ قرآن میں آیا:

”انہوں (یوسف کے بھائیوں) نے کہا: ”اے سردار ذی اقتدار، اس کا باپ بہت بڑھا آدمی ہے اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں“ یوسف نے کہا: ”اللہ کی پناہ! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہو گئے“ (یوسف: 78-79)۔

یہ جہاں اسلام! اسلام کے مخالفین کیا اس دین کے قلع قمع پر تلے بیٹھے ہیں جو ”حق بحق دارر سید“ کے سنہری اصول کا داعی ہے۔ ان کی یلغار کیا اسلام پر یلغار نہیں؟

حق مساوات

آج کی دنیا میں ”مساوات، مساوات“ کا بہت غوغا ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے کہ چور کو حسابِ مذمت ہو تو وہ شور مچانا شروع کر دے کہ ”چور چور چور“۔ کہنے کو تو جمہوریت کا طرہ امتیازی یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر کہو

مہرہ کی برآمدگی رائے لیکن خود جمہوریت کو قائم کرنے کے لئے جو طریق انتخاب اختیار کیا جاتا ہے وہ صرف سرمایہ داروں کا من پسند کھیل ہے۔ الیکشن میں لاکھوں کروڑوں کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ ایک غریب، وہ خواہ لاکھوں صلاحیتوں کا مالک ہو الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سرمایہ داروں کا یہ سوچ میلہ صرف انتخابات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس نظام کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں اگر کاشتکاروں کی اکثریت ہو تو قانون سازی خود بخود کاشتکاروں کے حق میں ہوتی ہے۔ اگر تاجروں کا پارلیمنٹ پر قبضہ ہو تو زیادہ تر مراعات تاجروں کے حصہ میں آتی ہیں۔ غریب، بچارے بس خاموش تماشائی یا بے بس شہریوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسلام ”سرمائے“ کو معیار اہلیت بنانا ہی نہیں بلکہ علم و جسم کی مثبت صلاحیتوں کو بنانا ہے۔ قرآن میں آیا:

” (ان کی درخواست پر) ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طاہرات کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اس لئے کہ اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی ہمتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہوئے اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے“ (بقرہ: 247)۔

اسلام کے نزدیک اعلیٰ وادنیٰ کا معیار ہے لیکن رنگ نسل زبان مہرہ سرمایے وغیرہ کی بنیاد پر نہیں اللہ کے ڈر کی بنا پر پیدا ہونے والے مزاج کردار اور ساکھ پر فرمایا گیا:

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار (اللہ سے ڈرنے والا) ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (حجرات: 13)۔ یاد رہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو“ (بیہقی)۔

دنیا بھر کے دساتیر میں ”مساوات“ کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے لیکن انہی دساتیر میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کی ان کے دوران حکومت میں عدالتی حاضری بوقت ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ شاید اسی لئے کہ سیکولر نظام میں یہ عدالت میں حاضری کی نوبت اکثر آتی رہتی ہے۔ اسلام پہلے تو نظام ہی ایسا دیتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی عدالت میں حاضری کی نوبت ہی نہیں پڑتی اس لئے اللہ کا قانون خود اس پر اسی طرح نافذ ہوتا ہے جس طرح کہ عام شہری پر۔ خلیفۃ المسلمین اس معاملے میں ایک عام شہری کی طرح ہے بس ہوتا ہے۔ قانون سے بچ نہیں سکتا ہے۔ بنا بریں اس پورے نظام کی کارگزاری ایسی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کو عدالت میں حاضر ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن اگر کبھی کبھار ایسی ضرورت پڑ جائے تو خلیفۃ المسلمین کے عدالت میں حاضر ہونے میں کوئی ضابطہ حائل نہیں۔ شاید تاریخ میں پہلی بار دور خلافت راشدہ میں ضرورت پڑنے پر خلیفۃ المسلمین کو عدالت کے کئیرے میں نہ صرف دیکھا گیا بلکہ اس کے خلاف اور ایک یہودی کے حق میں فیصلہ ہوتے بھی دیکھا گیا۔

قریش کی ایک عورت فاطمہ نے چوری کی۔ ایک صحابی حضرت اسامہؓ نے اسے معاف کرنے کی سفارش کی۔ نبی رحمت ﷺ نے بال کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا جائے۔ مسلمان جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئی ہیں کہ وہ کم درجے کے لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی تھیں اونچے درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی ایسا کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا“ (بخاری، مسلم)۔

اسلام کے مخالفین خود تاریخ کی ورق گردانی کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ محض وطنی، لسانی، نسلی طرز کی مساوات ہی نہیں کیا انسانی سطح کی مساوات کی ان کو ضرورت نہیں؟ کیا وہ بھول میں نہیں؟

معاشی تحفظ کا حق

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک ہدایت کی رسائی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی طرح اس نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک رزق رسائی کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جاننا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سوپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے“ (ہود: 6)۔
ایک اور جگہ پر فرمایا:

”کتے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“ (عنکبوت: 60)۔

یعنی اسلام معاشی تحفظ کے حق کو اس قدر ترجیح دیتا ہے کہ ہدایت رسانی کے علاوہ یہ رزق رسانی ہے کہ جس کی ذمہ داری خالق کائنات نے خود اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ایسے میں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی شخص بھوکا یا بیمار ہے۔ لیکن واقعات کی دنیا میں تو ایسا ہے کہ بھوکا و بیمار رہتا تو درکنار، فاقوں سے مرنے والے اور سردی و گرمی کی شدت سے مڑ حال ہونے والے آج ہماری دنیا میں لاکھوں کروڑوں ہیں۔ اصل میں جس ہستی نے یہ رزق رسانی کی ذمہ داری لے رکھی ہے اس نے انسان کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی دے رکھا ہے۔ اگر دنیا بھر کے انسان وقت کے کسی بھی موڑ پر اس ضابطہ حیات کو اس کے پورے لوازمات و کوائف کے ساتھ نظام حیات میں تبدیل کئے رکھیں تو دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ بھوکا نہ آج ہے تو اس لئے کہ انسانوں نے اپنا وہ ضابطہ حیات اپنا ہی نہیں رکھا یعنی دیئے گئے ضابطہ حیات کی بجائے خود ساختہ ضابطہ حیات نافذ کر رکھا ہے یا ضابطہ حیات نافذ تو کر رکھا ہے لیکن اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ نہیں بلکہ اس اصل ضابطہ حیات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے ضابطہ کے ساتھ اپنی خواہشات و مفادات پر مبنی ضابطہ حیات بنا رکھا ہے۔ باقاعدہ دیگر جب بھی دنیا میں معاشی تشیب و فراز ہوتا ہے تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطہ حیات خاص شکل میں نافذ نہیں ہوتا۔ یعنی ضابطہ حیات اور نظام حیات ایسی صورت میں کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے آج ہماری دنیا میں بھوکوں اور تنگوں کے مرنے کی۔ یعنی ہماری اس زمین پر فراہمی رزق تو ہر انسان کے لئے ہے اگر کچھ لوگ بھوکے مرنے ہیں تو اس لئے کہ کچھ لوگوں کے کتے اور بلیاں ان بھوکے مرنے والوں کا رزق کھا جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جو ہر فرد تک رزق رسانی کرتا ہے بندوں کی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں درہم برہم ہوتا ہے جیسے کہ آج کی دنیا میں

ہمارے سامنے ہے۔ ہے تو وہ اسلامی نظام حیات انسانی زندگی کے ہر دائرہ کے متعلق لیکن موضوع کے اعتبار سے ہم اب اس کے معاشی پہلو کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اسلام ہر فرد پر واجب کرتا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے بلکہ بقدر استطاعت اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو کچھ بہتر پیدا کرنے میں لگا دے۔ قرآن میں آیا:

”انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی“ (نجم: 39)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت حرام ہے۔ یعنی اسلام میں پادریوں پر وجہوں پنڈتوں، بھروں وغیرہ جیسی اکاس۔یلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرانی روٹیوں پر گزر بسر کرنے والے اسلام کے نہیں غیر اسلام کا جز ہوتے ہیں۔

پھر اسلام ہر فرد کی کمائی میں دوسرے افراد کا حصہ طے کر کے اسے اجتماعی نظام خلافت کا معاون بناتا ہے۔ ایسے اتفاق کی تین اقسام ہیں:

1۔ نفقات واجبہ یعنی ان لوگوں پر خرچ کرنا جو ایسا قرابتی حق رکھتے ہیں جیسے والدین، بیوی بچے، بہن بھائی، دادا دادی، ماما مانی، پوتے نواسے اور دوسرے صلبی و رجمی رشتے دار۔

2۔ زکوٰۃ جو بیت المال میں جمع ہو کر آگے مستحقین بشمل فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ، نومسلموں کی تالیف قلوب، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کا قرض ادا کرانے، اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مسافروں کی ضروریات پوری کرنے وغیرہ میں تقسیم ہوگی۔

3۔ رشتہ داروں کی کفالت اور ادائیگی زکوٰۃ کے علاوہ صدقات و خیرات کی شکل میں ما داروں اور حاجتمندوں کی مدد کرنا۔ سائل و محروم کی ایسی مدد کو قرآن مجید اہل ثروت پر یوں فرض کرتا ہے جیسے وراثت میں وارثین کو۔ گوارے چھوڑا گیا ہے ہر اہل ثروت کی اپنی صوابدید پر۔ قرآن میں آیا:

”(کل سے نیچے والے وہ ہیں) جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے“ (معارف: 24-25) یعنی گو ہے تو صوابدید لیکن ہے ضروری جسے وہ خود طے کرتے ہیں۔

چونکہ سارے معاشی نظام کی بنیاد اس اتفاق پر ہے جو انفرادی سطح سے شروع ہوتا ہے لہذا چند آیات

ملاحظہ ہوں جو فرقہ کو اتفاق پر آمادہ کرتی ہیں:

”تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسد دے کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھا کر بھی اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے (بقرہ: 245)۔“

”دردناک سزا کی وعید سنا دو ان لوگوں کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیٹانیوں، پہلوؤں اور پٹنیوں کو داغایا جائے گا۔ یہ سب وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو اب اپنی سستی ہوئی دولت کا مزہ چکھو“ (توبہ: 33-36)۔

”اور لوگ پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو“ (بقرہ: 219)۔

کسی مسلمان کو پھر کھلی چھٹی نہیں کہ وہ حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر کما لے کر خرچ کرے۔ اسے ان حدود کا پابند کیا گیا ہے جو معاشرے کی ترقی و بہبود اور پورے نظام کی صفائی و ستھرائی کے لئے ضروری ہیں۔ ہم چند ایک حدود کا ذکر کرتے ہیں:

- 1۔ شراب، جوا، رشوت، فحاشی و بدکاری کے ذرائع آمدنی، ممنوعہ اشیاء کی خرید و فروخت، ماپ تول میں کمی، چوہا زاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا اور یوں معاشی استحصال کی راہ روک دی گئی۔
- 2۔ غیر شرعی مصارف، اسراف و فضول خرچی اور محکم کی ممانعت۔ ضیاع کا اس قدر انسداد کہ اسلام کھانے والے کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ پلیٹ کو خوب صاف کرے، باقیات سے لٹھڑا نہ چھوڑے۔
- 3۔ وراثت، وصیت، مہر اور طلاق کی صورت میں بیوی بچوں کے لئے مقررہ مدت تک مان و نفقہ وغیرہ کی ادائیگی، غرض یہ کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں مجتمع نہ ہو اور یہ بھی کہ گردش میں رہے۔

اب کچھ ریاست کی ذمہ داریوں کا جائزہ لیجئے۔ ریاست کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بیت المال کے نظام کو اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ جاری و ساری رکھے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہو کہ جو روٹی، کپڑا، مکان، سواری، علاج، تعلیم وغیرہ سے محروم رہے۔ نیز وہ معاشرہ میں کسب حرام کے تمام دروازے بند

کرے کسپ حاکم کی راہیں کشادہ کرے اور تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کر کے حصولِ روزگار آسان اور یقینی بنائے۔ خلافتِ وقت کی یہ بھی ذمہ داری کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار کرے تو وہ قانوناً اسے کفالت کا پابند کرے۔ کوئی شوہر بیوی اور بال بچوں کے حقوق سے اعراض کرے تو انہیں ان کا حق بڑا دلا دیا جائے۔ چوروں، ڈاکوؤں، ریزنوں، راشیوں، بدعنوانی کے مرتکبوں کو شرعی سزائیں دلوانے کا سرعتِ انتظام کرے۔ نیز معاشی نظام کو اسلام کے دوسرے نظامِ بائے زندگی سے ہم آہنگ کرے۔

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام! ایسے جتن نصابِ معاشرے کو جنم دیتا ہے جس میں کوئی ایک فرد بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ جس کا کوئی کفیل نہ ہو اس کی کفالت کا بندوبست خلافتِ وقت کرے۔ کیا انسانیت کو ایسے نظام کی ضرورت نہیں؟ اسلام پر یلغار کرنے والے کیا انسانیت پر یلغار نہیں کرتے؟

حصولِ انصاف کا حق

انسان کی ایک بنیادی ضرورت ”حصولِ انصاف“ ہے۔ جس معاشرے میں انصاف ہوگا وہاں امن ہوگا، راحت و سکون ہوگا، خوشحالی ہوگی، امیر و مامور میں محبت و ہم آہنگی کا ماحول ہوگا اور سب سے بڑھ کر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوگا۔ اسلام نے انسان کے اس حق کو اتنی اہمیت دی ہے کہ انبیاء کی بیعت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد ہی ”قیامِ انصاف“ قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف ننانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان مازل کی تاک لوگ انصاف پر قائم ہوں“ (حدید: 25)۔

رسول ﷺ سے باہتمام اعلان کر دیا گیا، فرمایا:

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں“ (شوری: 15)۔

حصولِ عدل کا مقصد پورا نہیں ہوتا جب تک انصاف دینے والا نظام درج ذیل شرائط پر پورا نہ

اُترے

1۔ عدل نہ صرف قائم ہو بلکہ اس کا پرچم بلند ہو۔ کسی قسم کا لالچ، دباؤ، خوف، نفوذِ انصاف کی راہ میں

حائل نہ ہو۔

2۔ گواہی چچی اور ہر قسم کے لالچ، خوف، جانبداری سے پاک ہو خواہ اس کی زد خود گواہ پر، اس کے والدین اور دیگر اعزہ و اقارب پر پڑتی ہو۔ چچی گواہی دی جائے خواہ اس کے نتیجے میں جیسے کو بچانسی سے دو چار ہو جائے۔

3۔ گواہی دیتے وقت فریقین کا مقام و منصب، ان کی معاشی و معاشرتی حیثیت کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ مقصد صرف اللہ کی رضا ہو۔

4۔ گواہی و انصاف کو اپنی ذاتی خواہشات سے آلودہ نہ کیا جائے۔

5۔ گواہی بے لاگ صریح اور واضح ہو۔ ذو معنی، لگی لپٹی اور لالچی بھی بچ جائے اور سانپ بھی مر جائے جیسی پالیسی سے پاک ہو۔

ملاحظہ ہوا سلام ان شرائط کو کیسے احسن اور بھرپور انداز سے پورا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اے ایمان والو! انصاف کے طہر دار اور اللہ واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑے۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“ (نساء: 135)۔

قربان جائیں اس دین پر جو یہ بھی جتنی بنانا ہے کہ کسی دشمن کی دشمنی بھی انصاف دہی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ فرمایا گیا:

”کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کرو کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا پرستی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے“ (مائدہ: 8)۔

اسی آیت کی روشنی میں حضرت عمرؓ نے اپنے تانسیوں کو ہدایات جاری کیں۔ فرمایا:

”دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرو کہ تم غصہ میں ہو“۔

اسلام بدلہ لینے کا حق تو دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

”جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام رتھوں کے لئے برابر کا بدلہ۔“ (ماخذ: 45)۔

لیکن مضروب کو یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے تو یہ بڑے دل گروے اور صبر کا کام ہے۔ قرآن میں آیا:

”نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی ہے وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔ اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں“ (نہم سجدہ: 34-35)۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

”اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے“ (نحل: 90)۔

یعنی اگر کوئی بدلہ لینے کی بجائے معاف کر دے تو یہ ”احسان“ ہے۔ لیکن یہ احسان اس کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے ورنہ عدلیہ تو استغاثہ پیش ہونے پر عدلیہ کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ امام عادل تو ہوتا ہی وہ ہے جو عدل سے ہر موافقہ اور نہ ہونے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعریف کی ہے۔ فرمایا: ”امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے“ (مسند احمد)۔

یہ ہے اسلام کا عدل اجتماعی! انسانیت کو کیا ایسے عدل کی ضرورت نہیں؟ اسلام کے مخالفین کچھ تو سمجھ کریں۔

تنظیم سازی کا حق

اسلام قیہ و اصلاح کا دین ہے۔ تخریب و فساد کا قلع قمع کرتا ہے۔ جس طرح ایک باغ اپنی ہستی اور

خوبصورتی کو قائم اسی صورت میں رکھ سکتا ہے کہ کوئی مائی اس کی دیکھ بھال، کانت چھانٹ اور پرورش و پرداخت پر معمول ہو اسی طرح کوئی گھر، کوئی معاشرہ اور خود انسانیت اپنے وجود اور شان کو قائم نہیں رکھ سکتی اگر کوئی نگران اور گروہ اس کو بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے پر معمول نہ ہو۔ اسلام نے بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے، تعمیر کرنے اور تخریب سے روکنے کے لئے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ جیسے کج ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کی خاص اصطلاح استعمال کی ہے۔ عام اس کا مطلب نیکی کو فروغ دینے اور برائی کا قلع قمع کرنے کے لئے جانا ہے لیکن ظاہر ہے نیکی کو فروغ دینا اور بدی کا قلع قمع کرنا خود ہی معنی رکھتا ہے کہ سنوار کر رکھا جائے اور بگاڑ سے بچا جائے۔ یہ کام انفرادی سطح پر بھی کرنے کا ہے معاشرتی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ معاشرتی اور عالمی سطح پر ظاہر ہے یہ کام ایک ٹیم، ایک تنظیم اور بالآخر امت کی سطح پر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرد کو بھی اس کا پابند بنانا۔ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے اور اے نبی ان مومنوں کو بتا رت دے دو“ (توبہ: 112)۔

معاشرے کی سطح پر ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری قرار دیا جو یہی کام کرے۔ فرمایا:

”تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم اور برائیوں سے روکتی رہے۔ جو لوگ یہ کام کریں وہی فلاح پائیں گے“ (آل عمران: 104)۔

یعنی اصلاح و فلاح کی تنظیموں کا ہونا لازمی قرار دیا۔ چنانچہ یہی کام عالمی سطح پر کرنے کے لئے پوری امت مسلمہ کو ذمہ دار قرار دیا۔ فرمایا:

”(اے امت مسلمہ!) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: 110)۔

مل جل کر اصلاحی و فلاحی کام کرنے والی تنظیموں کے ہونے کو نبی کائنات ﷺ نے بھی لازمی قرار دیا جب فرمایا:

”جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوا وہ تباہ کر دوزخ میں گیا“ (ترمذی)۔

آپ ﷺ نے جماعت ہونے کے ساتھ اس میں نظم و ضبط کی بھی تاکید کی۔ فرمایا:

”جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں“ (ابوداؤد)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کس کو فکر ہے دنیا والوں کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی؟ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ طریق زندگی یعنی اسلام کو۔ اسلام پر حملہ آور ہونے والے کیا ایسی اصلاح و فلاح نہیں چاہتے؟

معصیت سے اجتناب کا حق

اسلام کا یہ منفرد اعزاز کہ اس نے اپنے ہر بشری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسے حکم کی تعمیل سے انکار کر دے جس سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ ایسا انکار اسلامی قانون کی نگاہ میں کوئی جرم نہیں بلکہ مجرم قرار پائے گی تو وہ اتھارٹی جو ایسا حکم دیتی ہے۔ ایسے میں بوقت ضرورت عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اطاعت سے انکار کرنے والے کو تحفظ مہیا کرے گی بلکہ معصیت کا حکم کرنے والوں کو سزا بھی دے گی۔ حدیث میں آیا:

”امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ اللہ و رسول ﷺ کی مافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب اللہ و رسول ﷺ کی مافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے نہ ماننا“ (بخاری)۔

قرآن مجید میں اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت اولی الامر (صاحب امر حضرات) کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اسلام کا نظام اطاعت محض اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مکمل نہیں ہوتا جب تک اولی الامر کی اطاعت شامل نہ ہو۔ البتہ وہی بات اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے اس بات سے کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع (اختلاف) ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف بھیج دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے“ (نساء: 59)۔

یہ ہے اسلام! کیا اسلام کے مخالفین کو ایسی آزادی عمل کی ضرورت نہیں؟

سیاسی زندگی میں شرکت کا حق

انسانیت کی ایک اور اہم ضرورت ہے کہ اجتماعی معاملات طے کرنے میں ہر کس و ما کس کو شمولیت کا حق ہو۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں“ (شوری: 38)۔

البتہ جیسے کہ ایک عمارت کی تعمیر میں متعلقہ انجینئروں اور ماہرین سے مشورہ لینا ہی سودمند ہوتا ہے کار خلافت چلانے کے لئے اگر کبھی قرآن و سنت سے براہ راست کوئی نص نہ ملے تو خلیفۃ المسلمین کو مشورہ ارکان شوریٰ سے لینا ہوتا ہے جو پوری امت کے اسی طرح معتقد نمائندے ہوتے ہیں جس طرح کہ خود خلیفۃ المسلمین۔ ان حضرات کو ان کی اہلیت کی بنا پر آگے لایا جاتا ہے جو قرآنی معیار اہلیت کے مطابق پانچ اوصاف یعنی ایمان (نور: 55)، تقویٰ (حجرات: 13)، صلاح (نور: 55)، علم اور جسم (بقرہ: 247) پر مشتمل ہے۔ ارکان شوریٰ ہوں یا اور عہدے دار اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ ان پر صرف اہل حضرات کو تعینات کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت (بشمول عہدے) اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے“ (نساء: 58)۔

مطلب یہ کہ سیاسی زندگی میں شرکت کا حق تو اسلام ہر کس و ما کس کو دیتا ہے لیکن ایسے معتقد نمائندوں کے ذریعہ سے جو قرآنی معیار اہلیت پر پورے اترتے ہوں۔ یاد رہے آج کی رواں دواں جمہوریت میں ”سرمایہ“ ہی عوامی نمائندوں کے انتخاب میں واحد اہلیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اسلام ایک تو ”سرمائے“ کو معیار اہلیت ہی قرار نہیں دیتا، ایک محنت کش اور دوزادہ زکا دیہاتی بھی معتقد نمائندہ چنا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ قرآنی معیار اہلیت پر پورا اترتا ہو۔ دوسرے اسلام میں کسی بھی عہدے کے لئے کوئی بطور امیدوار کھڑا ہو کر عہدہ حاصل کرنے کی ٹنگ و دو ٹنگ نہیں کر سکتا۔ اسلام کسی بھی شہری کو ووٹ کا محتاج بناتا ہی نہیں اس لئے کہ مجلسی ووٹ ہی سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”نہیں دیتے ہم عہدہ اسے جو اسے مانگتا اور مانگتا پھرے“ (بخاری و مسلم)۔

اسلام ہر کس و ما کس کو ایک اور ذریعہ سے سیاسی زندگی میں شرکت کا حق دیتا ہے اور وہ ہے بطور منتخب۔ اسلام میں مروجہ متحارب حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا کوئی وجود نہیں۔ صاحب اقتدار لوگ تو حزب اقتدار ہوتے ہی ہیں باقی ساری امت حزب اختلاف ہوتی ہے۔ کوئی بھی شہری خود خلیفہ المسلمین کا احساب کر سکتا ہے، دامن پکڑ کر یا بذریعہ عدالت۔ اس کے لئے اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ خلیفہ المسلمین روز و شب کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ دفعہ خود دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں حاضر ہوا اور امامت کرے۔ یہ بھی اسلام کا اعزاز و سائیکل اور درخواست گزاروں کو زحمت نہیں دیتا کہ وہ ہنگاموں کے پاس جائیں بلکہ ہنگاموں کو کم از کم پانچ اوقات میں لوگوں کے درمیان لانا ہے اور وہ بھی ایک پاکیزہ اور خدا ترس ماحول میں۔ یہ ہے اسلام! ہر کس و ما کس کو سیاسی زندگی میں بھرپور شرکت کا حق دینے والا۔ اصل میں اسلام کی مخالفت کرنے والے نہ صرف پوری انسانیت کی بلکہ بالواسطہ خود اپنی مخالفت کرتے ہیں، اکثر و بیشتر انجان پن میں۔

آزادی نقل و حرکت اور سکونت کا حق

اسلام اپنے ہر شہری کو نہ صرف اپنی مرضی کی جگہ آنے جانے اور وہاں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے اللہ کے احکامات و ہدایات کو جھٹلایا“ (آل عمران: 137)۔

بوقت ضرورت ہجرت کرنے کی ترغیب دی۔ فرمایا:

”جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور مسرعات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے پھر راتے ہی میں اسے موت آ جائے، اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشنے والا اور رحیم ہے“ (نساء: 100)۔

کسی جگہ پر اگر رواں دواں نظام ایسا ہو کہ وہ کسی کو اسلامی زندگی گزارنے کی راہ میں حائل ہو تو ایسی

جگہ سے کسی ایسی جگہ پر ہجرت کرنا کہ جہاں اسلامی زندگی گزارنا ممکن ہو لازم قرار دے دیا بلکہ ایسے میں ہجرت نہ کرنا خود پر ظلم قرار دیا۔ قرآن میں آیا:

”جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں ان کی رو میں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانہ ہے“ (نساء: 97)۔

اس آئے مبارک سے یہ بھی ماخوذ ہوتا ہے کہ ایسی جگہ جہاں پر اسلامی زندگی گزارنے کے زیادہ مواقع ہوں کو چھوڑ کر ایسی جگہ پر جانا کہ جہاں مقابلہ مواقع کم ہوں نہ صرف ممنوع بلکہ خود پر ظلم کرنا ہے۔ یہی وہ ایک قفل ہے جو من مرضی کی جگہ جانے کی اجازت نہیں دیتی اور یہ بھی اس لئے کہ ایسی صورت میں ایک مسلمان اپنے آپ پر خود ظلم کرنا ہے۔ البتہ یہ بھی کہ ایسی جگہ پر بغرض تعلیم، علاج، تبلیغ جانے اور مقصد حاصل ہوتے ہی اولین فرصت میں واپسی کی اجازت ہے۔ جس خوبصورت انداز سے اسلام دنیا بھر میں نقل و حرکت اور سکونت کی اجازت دیتا ہے، اسلام کے مخالفین کو کیا ایسی انسانی ضرورت کے پورا ہونے کے حق میں نہیں؟

اجرت اور معاوضہ کا حق

آج کی دنیا میں آجر و اجیر، مالک و مزدور کے درمیان اکثر و بیشتر کشیدگی کی صورت پائی جاتی ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے، مثالوں اور تالہ بندیوں تک نوبت آئی ہے، اسلام ان میں سے ایک ایک کا مداوا کرتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ پچھلے مزدوری کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ کئی معاشروں میں تو ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسلام نہ صرف ایسی ذہنیت کا سخت مخالف ہے بالخصوص وہ ہاتھ سے کمائی کرنے والے کو عزت بخشتا ہے، نئی کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”ہاتھ سے کمائی کرنے والا اللہ کا محبوب ہے“

اسلام میں، جیسے کہ پہلے ذکر ہوا رنگ، نسل، زبان، علاقہ، عہدہ وغیرہ معیار فضیلت نہیں، ادنیٰ و اعلیٰ

ہونے کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ کارکن کا استحصال کرتے ہوئے اس سے طے شدہ جہز ارادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اسلام نے اس رجحان کا سختی سے قلع قمع کیا ہے۔ فرمایا:

”ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔“ (مومنون: 62)۔

اسی بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”مزدوروں کو معروف کے مطابق مناسب ہتھ اور لباس دیا جائے اور ان پر کام کا اتنا ہی بار ڈالا جائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتے ہوں“ (موطا امام مالک)۔

یعنی اس حدیث پاک میں یہ بھی تاکید کی گئی کہ کارکن کو مناسب معاوضہ دیا جائے اس لیے کہ معاوضے کا پہلو بھی اکثر مالک و مزدور میں نزاع کا باعث بنا رہتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ مزدور کو مزدوری کی ادائیگی میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس بارے میں اسلام نے جو سنہری اصول دیئے ان میں سے محض ایک اصول صنعت و حرفت کے پورے نظام کو رحمت و شفقت کا مظہر بنا دیتا ہے۔ فرمایا:

”مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے“ (بیہقی، ابن ماجہ)۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ”مزدور کی اجرت طے کئے بغیر اسے کام پر نہ لگایا جائے“ (بیہقی)۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہو گا۔ ایک وہ جس نے میرا مال لے کر ہمد کیا اور اس سے پھر گیا۔ دوسرا وہ جس نے آزاد کو بیچ کر اس کا مول کھایا اور تیسرا وہ جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کی“ (بخاری)۔

ایک اور پہلو جو مالک و مزدور میں نزاع کا باعث بن جاتا ہے یہ ہوتا ہے کہ مزدور مزدوری تو لینے کے درپے ہوتا ہے لیکن کام کرنے میں ڈنڈی مارتا ہے یعنی کام چور ہوتا ہے۔ اسلام نے اس ذہنیت کا بھی نوکس لیا ہے۔ فرمایا:

”اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا“ (نجم: 39-41)۔

یعنی معاملہ صرف اس دنیا تک محدود نہیں۔ واسطہ اس ہستی سے ہے جو اندرون دل اور نیتوں تک کو جاننے والا ہے۔ جان بوجھ کر کام میں ڈنڈی مارنے والے کو اپنے ہر عمل کا حساب ایک دن بھگتنا ہے۔ ایک اور وجہ جو آج اور آج کے مائین اکثر کشیدگی و نفرت کا باعث بنتی ہے وہ ہے آج کی بلا دینی (High handedness) اور آج کا گستاخانہ رویہ (Rudeness) اسلام ان امراض کا مجموعی زندگی میں مداوا کرتا ہے۔ فرمایا:

”ایک مینھا پول اور غلطی معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔“ (بقرہ: 263)۔

قرآن مجید بڑے پیار سے رسول اللہ ﷺ کی ایک صفت کو بیان کرتا ہے۔ فرمایا:

”(اے پیغمبر!) یا اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کی غلطیوں سے درگزر کرو۔ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور معاملات میں ان کو بھی شریک مشورہ کرو۔“ (بقرہ: 159)۔

دنیا میں اسلام کے علاوہ کیا کوئی دوسرا نظام ایسا ہے جو آج و آج کے مائین اس قدر خیر خواہی، الفت اور جذبہ محبت پیدا کرے؟ کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسے مبارک نظام کی ضرورت نہیں؟ کس قدر نادانی اسلام پر یلغار کرنے والوں کی!

خلاصہ کلام و چند شبہات اور ان کی وضاحت

اسلام کیا ہے؟ انسانیت کی بھلائی، خیر خواہی اور بہتری کا دوسرا نام اسلام ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کا صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کہ صاف ستھرے رہو بلکہ اس کے نزدیک صفائی نصف ایمان ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صفائی کیا انسانیت کی ضرورت نہیں؟ کیا انسان کو غلط رہنا چاہئے؟ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ حلال کمائی کرو۔ مباح زکوٰۃ سے یا کسی کو دھوکا فریب دے کر یا کسی دوسرے کے نقصان پر خود فائدہ حاصل نہ کرو۔

ذخیرہ اندوزی مت کرو یعنی مال کو اس لئے نہ روکو کہ مہنگا ہوگا تو دو گئے کائیں گے۔ ملاوٹ، سنگٹنگ، رشوت، بدعنوانی، کام چوری وغیرہ یعنی ہر وہ روش جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اسلام اسے ناجائز اور گناہ قرار دیتا ہے۔ کیا رزق حلال کے متعلق یہ تعلیمات انسانیت کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟ اسلام چاقی کے ساتھ معاملہ کرنے والے ماجر کو قیامت کے دن نبیوں، صدیقیوں اور شہیدوں کا ساتھی قرار دیتا ہے تو کیا یہ امانت دارانہ تجارت انسانیت ہی کی بھلائی کے لئے نہیں؟ اسلام کا مطالبہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر ظلم نہ کرے۔ یہاں تک فرمایا کہ ”جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین ظلماً لے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈالے گا۔ ظلم کا قلع قمع کرنا کیا انسانیت کے حق میں مفید نہیں؟ اسلام کی ہدایت یہ بھی ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ یقین جانیں اگر پوری انسانیت اس ایک اصول کی پابندی کرتی تو سرمائے اور محنت کے درمیان آج جو گہرے مسائل پیدا ہو چکے ہیں کبھی پیدا نہ ہوتے۔ اسلام کی یہ بھی تعلیم ہے کہ ضرورت سے زائد پانی نہ روکو یعنی اپنا حصہ تو ضرور لو لیکن دوسروں کا حصہ ان کو دو۔ اسلام کا یہ بھی منبری اصول ہے کہ جو کچھ تم اپنے لئے پسند کرو، اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو۔ جتنے نسا بن جائے یہ دنیا اگر اس بے مثل اصول پر پوری انسانیت عمل پیرا ہو۔ اسلام کا یہ بھی قانون ہے کہ مرنے والے کی جائیداد اس کے وارثوں میں، مردہوں یا عورتیں، تقسیم کرو۔ پھر اسلام اس تقسیم کو یوں متناسب و متوازن بناتا ہے کہ معاشرے میں جتنا کسی پر زیادہ بوجھ ہے اتنی ہی وراثت میں اسے زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔ ورنہ کو یوں اپنا اپنا مقرر حصہ و حق کا حصول کیا انسانی فلاح کا ضامن نہیں؟ اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ دیکھئے اسلام کی اس ایک تعلیم سے انحراف نے آج پوری دنیا کو عالمی سودی نظام کی شکل میں جس قدر تباہی کے دبانے لاکھڑا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسلام رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجتا ہے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ رشوت کا جندہ انسانیت کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے؟

اسلام نکاح کی ترغیب داتا کید اور زنا کی قطعاً ممانعت کرتا ہے۔ مغربی دنیا اس کے برعکس اگر آج عمل پیرا ہے تو خود محسوس کر رہی ہے کہ یا ایک گمراہی شاید اسے صفیر، ہستی سے منادے۔ انسانی رشتوں کا تقدس ماضی کی داستان بن چکا ہے۔ گھروں پر ان ہو گئے۔ خاندانی یونٹ کا شیرازہ بکھر گیا۔ بظاہر انسان لیکن گرے تو اس حد

تک کہ بلیوں اور کتوں سے دل بہلانے لگے۔ پھر یہ بھی اسلامی ہدایت ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اس ہدایت سے بھی مغرب والوں نے روگردانی کی تو آج بڑی عروا لے ”معمرخانوں“ میں مقید اپنی اپنی اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس گئے۔ اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ہر زیر دست و ماتحت یعنی نوکر، خادم وغیرہ سے شفقت سے پیش آؤ تو کیا ایسا کرنا انسانیت کے حق میں نہیں؟ اسلامی امت کا ایک فرض منہیں یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کلمات عامہ کا نظام رائج کرے یعنی ہر معذور بے روزگار بے سہارا وغیرہ کا وظیفہ مقرر کرے تو کیا ایسا پروگرام انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں؟ اسلام کا یہ بھی دستور ہے کہ ہر اس فرد کی طرف جو گردشِ دوراں کا شکار ہو گیا ہو مثلاً بیوہ بے سہارا، یتیم مسکین ہو یا قیدی دستِ تعاون بڑھاؤ۔ سائل بھرہم کو تو کھاتے پیتے لوگوں کا شریک دولت بنا دیا۔ دنیا بھر کے اقتصادیات کے ماہرین اگر صرف اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کا تجربہ کریں تو مانے بغیر نہ رہیں کہ کتنا برکتوں اور سعادتوں بھرا ہے یہ نظام بے بدل۔ والدین، اولاد، رشتے داروں، استاد شاگرد، آجر مزدور، میاں بیوی کے حقوق کی فہرست دی تو لمبی چوڑی۔ کیا ایسا نظام انسانیت ہی کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟

اسلام ہی کی یہ تعلیمات ہیں کہ وقت کی پابندی کرو، عہد کا پاس کرو، بیچ بولو، جھوٹ مت بولو، جھوٹی گواہی نہ دو، فریب و دھوکا دی کے قریب نہ جاؤ، عجز و انکساری کا دامن قہر و غرور کو قریب نہ پہنچنے دو، حق سے زیادہ کی حرص نہ کرو، عہدوں کو لپٹائی ہوئی نگاہوں سے نہ دیکھو، بے جا حمایت اور طرفداری نہ کرو، لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو، چغل خوری اور غیبت سے پرہیز کرو، کسی کو گالی نہ بکھو، نہ کسی کو برے القاب سے یاد کرو، کسی کی تحقیر نہ کرو، کم درجے والوں کا احترام کرو، بے جا تعریف نہ کرو، حسد سے بچو، بدنگاہی سے بچو، جذبات کا شکار نہ ہو، دھار اور سنجیدگی کا دامن قہر و غرور کی حفاظت کرو، ایذا رسانی کا رویہ ممنوع، آشنا ہو یا ما آشنا جو سامنے آئے اسے سلام کرو، خیر خواہی و بھلائی کا وطیرہ اختیار کرو، عظم حاصل کرو، جہالت سے بچو، جماعتی زندگی گزارو، ایک دوسرے کے ہمدرد و سناٹھی بنو، ضبط و تحس کا دامن باتھ سے نہ چھوٹے پائے، انکم و ضبط کی پابندی کرو، امیر کی اطاعت لازم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین۔ بتائیے ان احکامات میں سے کوئی ایک بھی ہے جو انسانیت کے حق میں سراپا خیر نہ ہو؟ اسلام کا تو یہ بھی طرہ امتیاز ہے کہ وہ ان احسن اوصاف و

عادات کو ایک یا چند افراد تک محدود نہیں کرنا لازمی قرار دیتا ہے کہ دنیا کے ہر فرد تک خواہ وہ کہیں ہمالہ پر ہی کیوں نہ ہو پہنچایا جائے تاکہ یہ پوری دنیا حسن و خوبی کا مرقع ہو۔

پھر دوسرے حق... اسلام شکر نعمت کی تعلیم دیتا ہے، صبر و استقامت کا درس دیتا ہے۔ شرم و حیا کی تلقین کرتا ہے، عریانی و فحاشی کو انسانیت کے لئے تباہی و بربادی ٹھہراتا ہے۔ پردے کے مفصل قوانین دیتا ہے۔ انسانیت کو بدراہ روی سے روکنے کے لئے عبادات کا ایک جامع اور مستقل پروگرام دیتا ہے۔ اللہ پر بھروسے کی تلقین کرتا ہے۔ خدمت خلق، امن و سلامتی، علم و برداری کی تاکید کرتا ہے۔ شراب جوئے سے بغیرہ کو حرام قرار دیتا ہے۔ جزا و سزا، جنت و دوزخ کا نظام وضع کر کے بندوبست کرتا ہے کہ ہر انسان اپنی خیر خواہی و فلاح کی خاطر مذکورہ احکامات کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔ شتر بے مہار اور مارچر آزاد ہو کر میناں نہ کرے۔

ایک طرف تو اس سے انکار ممکن ہے کہ اسلام ہے ہی سچائیوں، بھلائیوں اور خیر خواہیوں کا دوسرا نام لیکن دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ایک عظیم آبادی اسلام کے فیوض و برکات سے محروم ہی نہیں بلکہ اس کی مخالف ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ تجزیہ کریں تو بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ سچائیوں کا حصول اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان کچھ پابندیاں قبول کرے، کچھ قربانیاں دے اور کچھ مشقتیں جھیلے۔ سڑک پر نصب کردہ ٹریفک کے اشارات یوں تو پابندیاں لگاتے ہیں لیکن ظاہر ہے منزل مقصود پر بہ حفاظت پہنچنے کے لئے ان کی پابندی کرنا از بس ضروری ہے۔ اس طرح پابندیاں قبول کرنا، قربانیاں دینا اور مشقتیں جھیلنا ہے تو انسانی فلاح و بہبود کا ضامن لیکن سب پسند انسان ان سے حیلے بہانے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ٹریفک کے اشارات کی پابندی نہ کرنے کے نتائج تو خیر فوراً سامنے آ جاتے ہیں لیکن اخلاقی اقدار کو ملیا میٹ کرنے کے نتائج آخرت میں تو یقیناً برآمد ہوں گے ہی اس دنیا میں بھی برآمد ہو کر رہتے ہیں خواہ کچھ دیر کے بعد ہی کیوں نہ ہوں۔ آج کی دنیا اگر ظلم و ستم، امتیاز و غفلت، جس کی لالچی اس کی بھینس، دوہرے معیار، نفسا نفسی اور افراط و تفریط کا شکار ہے تو اس کی بنیادی وجہ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت کا سچائیوں سے فرار ہے۔ ایسے دانشور بھی آدھمکے ہیں جنہوں نے اسلام ہی کو متنازع و حریف تنقید بنا دیا تاکہ فرار فرار ہی نظر نہ آئے بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی غائب اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے کئی جواز

ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے کوئی شرابی شراب پی کر جب احساس گناہ سے مطلوب ہونے لگتا ہے تو خود کو یہ کہہ کر اس احساس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ ”پلو شراب ہی پی ہے کسی کا خون تو نہیں پیا“۔ اسلام کے چند ایسے پہلوؤں کو جنہیں ان دانشوروں نے ہدف تنقید ہی نہیں ہدف تحقیر و استہزاء بھی بنایا ہے کا ذیل میں ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلیت سے آگاہی ہو۔ یعنی یہ وضاحتیں بس معترضین کے ایک خاص طبقہ کے لئے ہیں ورنہ ایک مسلمان کے لئے اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے ثابت ہونے کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

- ☆ تعددِ ازواج یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا۔
- ☆ مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات۔
- ☆ اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا۔
- ☆ جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں مسلح جدوجہد۔

ذیل میں ان پہلوؤں میں سے ہر ایک کا ہم جائزہ لیتے ہیں یہ جاننے کے لئے کہ آیا زیر بحث و تنقید یہ پہلو انسانیہ کے حق میں ہیں یا کہ مخالف۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان موضوعات کی طرف آئیں دو دنیاوی باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کا مرکزی تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو دنیا میں نہیں ہو جاتا بلکہ ایک ایسی زندگی میں داخل ہوتا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس دنیا میں کیئے گئے اس کے ہر فعل کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور قیامت کے دن یہ ریکارڈ نکال لایا جائے گا یہ طے کرنے کے لئے کہ اس انسان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا برائیاں؟ نیکیوں کا پلڑا جھک گیا تو اسے جت نصیب ہوگی اور برائیوں کا پلڑا جھکا تو دوزخ اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ دوسری بات جو نوٹ کرنے کے قابل ہے یہ ہے کہ اسلام کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ وہ ہر فرد ہر دہریہ عورت کو وراثت میں حصہ دار بناتا ہے اور وراثت کا یہ نظام ظاہر ہے سچی چل سکتا ہے جب ہر فرد کی نسلی شناخت ہو یعنی جتنی پتہ ہو کہ اس کی ماں کون ہے اور باپ کون؟ اب تفصیل ملاحظہ ہو:

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج (polygamy) کے بارے میں یہ ذہن میں رہے کہ اسلام نے اسے دنیا میں

متعارف نہیں کرایا بلکہ ان گنت معاشروں میں یہ پہلے سے موجود تھی۔ اسلام نے صرف اسے محدود و باقاعدہ کیا۔ اس میں سب سے بڑی جو بے قاعدگی موجود تھی وہ بیک وقت بیویوں کی تعداد میں کسی حد (Ceiling) کا نہ ہونا تھا۔ کھاتے پیتے حضرات سینکڑوں بلکہ ہزاروں بیویوں کی فوج ظفر مونج اکٹھی کر لیتے تھے اور اس جہوم بے کنار کے لئے ایک خاص اصطلاح یعنی ”حرم“ کا چرچا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عورت کی حیثیت ایک محترم و معزز انسان سے کم ہو کر صرف ایک قابل استعمال چیز (Commodity) کی رہ جاتی تھی۔ اسلام نے تعدد و ازدواج پر پابندی لگائی اور اب کوئی عرب پتی مسلمان بھی کہ جس کی جائیداد دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہو بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ تاہم ہمارا آج کا موضوع، صرف یہ ہے کہ یہ چار بیویاں بھی شروع کیوں ہیں؟ ایک ہی کیوں نہیں؟

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ دنیا میں کوئی معاشرہ خالص یک زوجی (mono gamous) نہیں رہا اور نہ ہے۔ جس طرح اس دنیا کے کئی معاشروں نے رہبانیت اور بے زوجگی کا تجربہ کیا لیکن انجام کار فطرت سے اس انحراف کو نباہ نہ سکے بلکہ اکثر و بیشتر نے ازدواجی تعلقات کو عبادت ہی کا حصہ بنادیا اسی طرح دعویٰ تو آج بھی کئی معاشرے یک زوجی کا کرتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں متحدہ دیویوں کا کسی نہ کسی طور رستہ نکال لیا ہے۔ یہ عصمت فروشی (prostitution) زنا (adultery) اغوا (abduction) ورنٹلا (seduction) عارضی شادی (temporary marriage) آزمائشی شادی (Trial marriage) محبت کی شادی (love marriage) جھوٹا رہائش (mixed living) مشترکہ رہائش (cohabitation) ہمدردانہ شادی (compassionate marriage)، آخر ہفتہ آوارہ گردیاں (week-end wanderings) ساحلی عیاشیاں (beach picnics) ہم جنس شادیاں (one sex marriages) بعد از طلاق شادیاں (re marriages) آخر کس شرارت اور کس رجحان کا شاخسانہ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب انسانی فطرت پر مصنوعی پابندیاں لگائی گئیں تو اس ایک سرور دو ہاتھوں والے انسان نے کئی راستے خود نکال لیے۔

اسلام جو دس فیصد نسل ہے کیسے بر داشت کر سکتا تھا کہ وہ انسانوں کو بے قاعدہ گیوں، بے ہود گیوں اور بے راہ رویوں کے حوالے کر دیتا؟ اس نے اس بے جھگم و بے قاعدہ ڈرامے کو با قاعدہ (systematize) کیا ہے۔ آپ اس بارے میں جتنا بھی سوچیں با آخرا اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ اسلام نے تعدد و ازواج کی اجازت دے کر اور اس اجازت کو ایک حد یعنی چار بیویوں تک محدود کر کے انسانیت کی بے مثل خدمت کی ہے۔

مذکور بالا بحث تو ہم نے محض انسانی سرشت کے حوالہ سے کی ہے لیکن واقعات کی دنیا میں ان گنت ایسے عملی حقائق ہیں جن سے بہر حال اس دنیا کے کینوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ چند ایسے حقائق، جن سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں، کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ گویا نسل پر اس دنیا میں مردوں اور عورتوں کی تعداد پچاس پچاس فیصد ہوتی ہے لیکن چونکہ مرد حضرات اپنے فرائض کی نوعیت کے اعتبار سے ساوی بلاؤں اور حادثات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہذا وقت کے کسی بھی موڑ پر دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے ہاں پاکستان میں مثال کے طور پر عورتوں کی تعداد 52 فیصد ہے تو مردوں کی 48 فیصد۔ اس طرح دنیا بھر میں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے کروڑوں زیادہ ہے۔ لیکن اگر ایک کروڑ زائد بھی فرض کر لی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک زوجگی کی صورت میں ایک کروڑ عورت کا یہ حق چھن جائے گا کہ وہ شوہر والی ہو۔ بتائیے اس سے بڑا ظلم کسی عورت پر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے نا حیات حق زوجیت سے محروم کر دیا جائے۔ وہ بے شوہر، بے اولاد اور بے گھر رہے۔ اگر تعدد و ازواج کو ایک برائی فرض کر لیا جائے تو یہ بے زوجگی تو اس سے کئی گنا بڑی برائی ہے۔ جنگ عظیم اول و دوم میں جب عورتوں اور مردوں کا باہمی تناسب غیر معمولی طور پر درہم برہم ہو گیا یعنی مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں متحدہ کم ہو گئی تو اس مسئلے کو جس طرح کئی غیر مسلم معاشروں نے حل کیا بے حل ہی رہنے دیا، انسانیت کے ماتھے پر وہ کلک کے ٹپکے سے کم نہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ جنگ تو کبھی کسی ایک ملک میں ہو گئی یا نہ ہی ہوئی لیکن تعدد و ازواج کو ہمیشہ کے لئے ایک ضابطے کی حیثیت دے دینا کیا حماقت نہیں؟ یاد رہے اول تو کوئی جنگ کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہتی

اور اگر رہے بھی تو بین الاقوامی شادیوں کی اس دنیا میں ایک عام ریت ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور جنگ و جدل کی زد میں رہتا ہے۔ پھر مرد و پانکٹ بھی ہوتے ہیں، ڈرائیور بھی، ملاج بھی، مزدور بھی، ملکینک بھی اور فوجی جوان بھی بتائیے بالعموم حادثات کا شکار مرد زیادہ ہوتے ہیں یا عورتیں؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہر آدمی چار چار شادیاں کرے تو کیا اس صورت میں عورتوں کی کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ ایسا نہ ہونے کا ویسے تو یہی ثبوت کافی ہے کہ دنیا کی شادیاں کا جائزہ نہیں غیر مسلم دنیا کی تو بات درکنار، مسلم ممالک میں بھی باوجود چار بیویوں کی اجازت کے عورتوں کی تعداد اکثر و بیشتر مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ دنیا میں 99.9 فیصد مسلمان ایسے ہیں کہ جو یک زواج ہیں۔ اصل میں دو، تین یا زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت ہے، حکم نہیں اور یہ اجازت بھی غیر معمولی حالات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے ورنہ اس میں کیا شک ہے کہ یک زواج ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے (nothing like one wife)۔ عمل کی دنیا میں جتنا گھریلو سکون و راحت ایک بیوی سے ہوتا ہے، دو یا دو سے زیادہ سے نہیں ہوتا۔ کسی کو شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ تعدد ازواج کی صورت میں ویسے تو بے اعتمادی کی فضا کا ہونا ایک لازمی امر ہے، پھر اکثر و بیشتر اولاد کی باہمی چپقلش اور جائدادوں کے جھگڑے بسا اوقات بڑے ہولناک نتائج کو جنم دیتے ہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب (چار تک) متعدد بیویاں ہوں گی تو امکان الغلب ہے کہ شوہر کسی ایک بیوی کو دوسری پر ترجیح دے اور اس طرح دوسری بیوی ایویوں کی حق تلفی بلکہ دل شکنی ہو۔ اجازت دینے والا اللہ اس جھول کو خوب جانتا تھا لہذا اس نے متعدد بیویوں کی اجازت غیر مشروط نہیں شرط دی ہے اور اس بارے میں شرط ہے یہ کہ ہر بیوی سے مساوی سلوک کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”اور اگر تم قیہوں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو“ (النساء: 3)۔

باغاطد دگر دو اور دو سے زیا دہ بیواں اور چار تک رکھنے کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی عدل کی شرط پوری نہ کر سکے تو اس کے لئے تعدد ازواج کی اجازت ہے ہی نہیں۔ کوئی معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ چلو اجازت شرط سہی لیکن کوئی مرد اس اجازت سے ما جائز فائدہ بھی تو اٹھا سکتا ہے یعنی وہ دوسری شادی تو شرط قبول کرتے ہوئے کرتا ہے لیکن بعد میں شرط پر قائم نہیں رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شوہر ایسا بھی کر سکتا ہے لیکن اگر وہ ایسا کرے تو اسلام کی نگاہ میں اسی طرح گناہگار اور محرم ہے جیسے کہ وہ کوئی اور گناہ کرے۔ گناہ کے مرتکب کو تو بہر حال روز محشر احتساب کی چیلنی سے گزرنا ہے وہ کسی طور اپنے کئے کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم اسلام ایسے شخص کی گرفت کو صرف آخرت میں ہی جھٹی نہیں بناتا اس دنیا میں اسلامی حکومت کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف کرنے سے قاصر رہا ہو ان کی دادی کرے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص تعدد ازواج کی سہولت کو غلا استعمال کر سکتا ہے وہ تو یک زوجگی کو بھی غلا استعمال کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں ایسے انسانوں کا وجود نہیں کہ جو طلاق پر طلاق دے کر نئی شادیاں کرتے ہیں؟ تاریخ میں ایسے ایسے یک زوج بھی پائے گئے ہیں کہ جنہوں نے سو سو تک شادیاں کیں۔

انسانوں کی دوسری ضرورت جس کے لئے تعدد ازواج کی سہولت ایک نعمت غیر مترقبہ بت ہو سکتی ہے وہ صورت ہے کہ جب بیوی بانجھ ہو، بیمار ہو یا مجذوب وغیرہ ہو۔ ایسے میں ایک شخص کو مجبور و محدود رکھنا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے ظاہر ہے اسے ایک بڑے انسانی حق سے محروم رکھنا ہے۔ فطرت کے خلاف لڑنے کے عادی معاشرے تو شاید اس حق کو خصب ہونے دیں لیکن اللہ کی دی ہوئی شریعت یہ برداشت کرے تو کیسے؟

آخر میں ہم ایک اور اعتراض کا جائزہ لیتا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کوئی شریر یہ اعتراض بھی تو کر سکتا ہے کہ جب شوہر کو چار تک متعدد بیواں رکھنے کی اجازت ہے تو بیوی کو ایسی اجازت کیوں نہیں کہ وہ متعدد شوہر (polyandry) رکھے؟ بظاہر یہ اعتراض ذہن کو بڑا اکیل کرتا ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیں تو اس حماقت کا بھید کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ وہ مرد ہو یا عورت کسی کو وراثت سے محروم نہیں کرتا۔ قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہوا بہت حصہ (ہر دو کا) بہر حال ہے“ (النساء: 7)۔

لاریب، وراثت کا یہ نظام بھی رو بہ عمل ہو سکتا ہے جب کہ ہر فرد، مرد و عورت کا نسلی تشخیص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو یعنی روز روشن کی طرح واضح اور مسلمہ ہو کہ اس کا باپ فلاں ہے اور ماں فلاں۔ اس میں بھی کیا شک کہ متعدد شوہروں کی صورت میں یہ نسلی تشخیص مشکوک و مبہم ہی نہیں کلین و رہیم ہو کر رہ جاتا ہے۔ متعدد شوہروں میں سے ہر ایک کی یہ حتمی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اولاد کا بوجھ اس کی بجائے، کسی دوسرے شوہر پر پڑے۔ یہی نہیں بلکہ ہر شوہر کی کوشش و خواہش ہوگی کہ ٹھیکہ خراجات سے کم سے کم برداشت کرنے پڑیں۔ شاید یہاں تک نوبت آجائے کہ بیوی کو ان شوہروں کے زرخے سے نکل کر اور خود نکاح کر اولاد کا پیٹ پالنا پڑے۔ اسلام تو بیوی اور اولاد کے مان و نقد کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے لیکن متعدد شوہروں والے گھر میں صورت حال بالکل اس کے برعکس ہو جائے گی۔ زیر آسماں شاید ظلم کی اس سے بڑی انتہا کوئی نہ ہو۔ تجربہ شائد فطری ظلم میں انسانی مداخلت ہوتی تو بد قسمتی، بے چینی، بے سکونی، بربادی و تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

اصل میں کئی معاشروں میں شروع سے متعدد شوہروں کا رواج رہا ہے لیکن بتدریج گھٹتا گیا اور آج نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ خود اس بات کا مین ثبوت ہے کہ یہ روش اور طریق تہذیب و تمدن ہے ہی ناقابل عمل۔ بھلا ہوا اسلام کا دنیا والے تو تجربات کر کے اس نتیجے پر پہنچے لیکن اسلام نے اول روزی سے اس کی نکتہ بندی کر دی۔ کیوں نہ انسانیت منوں احسان ہوا اسلام کی؟

مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اسلام نے راجی و رعیت، آجر و مزدور، سرمایہ و محنت، یتیم و یتیم، معذور و محروم، مسافر و قیدی وغیرہ میں سے ہر ایک کے حقوق کی پاسداری کی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک کے حقوق کا منصفانہ تعین نہ کرتا۔ ان کے مابین انصاف ہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے

لئے تو اسلام کا یہ منفر دکر دار ہے کہ اس نے مرد و عورت دونوں کو وراثت میں حصہ دار بنا دیا۔ اصل میں سچ میں لوگوں کو ان کے حقوق کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں اور عورت کی شخصیت کے بھی۔ جس طرح مرد کی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری باپ، شوہر، بیٹے وغیرہ کی اسی طرح عورت کی بھی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری ماں، بیوی اور بیٹی وغیرہ کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان باپ اور بیٹے کے حقوق یکساں ہیں لیکن کوئی بالکل پاگل نہ ہو گیا ہو ورنہ سوچے گا بھی نہیں کہ بطور باپ کے حقوق بھی وہی ہوں جو بیٹے کے۔ گھریلو نظام میں ہی اگر آپ باپ اور بیٹے کے حقوق ایک جیسے کر دیں، گھرباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان میاں بیوی کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں۔ ایسا نہیں کہ کوئی شوہر نیکی کرے تو اسے دوہرا جر ملے اور وہی نیکی بیوی کرے تو اسے اکہرا جر۔ البتہ گھریلو نظام میں جیسے باپ اور بیٹے کے حقوق یکساں نہیں ہو سکتے، میاں بیوی کے حقوق بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ دختر یا کوئی اور ایسا ادارہ عمل کی دنیا میں چند دن نہیں چل سکتا جس کے یکساں اختیارات کے دو انچارج ہوں۔ بالکل اسی طرح ایسے گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا جس میں شوہر اور بیوی یکساں حقوق کے دعوے دار ہوں۔ مغربی دنیا نے ایسا تجربہ کرنے کی کوشش کی لیکن نتائج جو اس تجربے سے برآمد ہوئے تو یہ کہ وہاں گھر کا وجود برائے نام ہو کر رہ گیا۔ یاد رہے گھر معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ بالفاظ دیگر متحدہ گھر مل کر معاشرے کو جنم دیتے ہیں اور متحدہ معاشرے ملیں تو قوم بنتی ہے اور متحدہ اقوام باہم ملیں تو انسانیت معرض وجود میں آتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر گھریلو بنیادی اکائی کا ادارہ درہم برہم ہو جائے تو انجام کار پوری انسانیت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ گھر کی بے سکونی بالآخر پوری انسانیت کو بے سکون کر دیتی ہے جیسے کہ آج پوری انسانیت بے سکون ہے۔ وقت کے اس موڑ پر مغربی دنیا کی بالادستی نے اس بے سکونی کے عمل کو چھینی ہی نہیں تیز تر کر دیا ہے۔

اسلام اسی لئے تو دس فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی فطری جگہ پر رکھتا ہے اسے یہ قطعاً گوارا نہیں کہ کوئی چیز اپنی فطرت سے تجاوز کرے۔ گھریلو نظام میں شوہر، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں وغیرہ کا اپنا ایک مقام تو بطور انسان ہے۔ اس حیثیت میں اسلام مرد اور عورت ہر دو کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ گھر میں اہل خانہ کی

دوسری حیثیت بطور شوہر، بیوی، بیٹیوں اور بیٹوں کی ہے۔ ان حیثیتوں میں اسلام انہیں مختلف حقوق دیتا ہے ایک جیسے ہرگز نہیں۔ اصل میں ایسا کرنا گھر کے ادارے کی پیش رفت کے لئے از بس ضروری ہے۔ ثبوت اس کا یہی ہے کہ اسلامی ممالک میں گھر کا ادارہ آج بھی کامیابی سے رواں دواں ہے جب کہ گھریلو نظام کی تباہی نے مغربی دنیا کو کتوں اور بلیوں کی قوم بنا دیا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ غیر اسلامی معاشرے مرد و زن کے حقوق کے بارے میں ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں یعنی کچھ معاشرے تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے مرد و عورت کو بطور انسان بھی مساوی حقوق نہیں دیئے اور کچھ دوسرے غیر اسلامی معاشرے اس حد تک آگے چلے گئے کہ جیسا اوپر ذکر ہوا انہوں نے مرد و زن کو بطور میاں بیوی بھی مساوی حقوق دیئے۔ جن معاشروں نے مرد و عورت کو گھریلو نظام میں مساوی حقوق دیئے ان کی گھریلو زندگی کیسے اجیرن ہوئی، اس کا تو اوپر ذکر ہو چکا یعنی گھریلو نظام کا جنازہ ہی نکل گیا، گھر سے میاں بیوی، بچے ویسے ہی راہ فرار اختیار کر گئے۔ اپنے گھر حوالے کر گئے، کتوں اور بلیوں کے۔ کسی گھر میں چلے جائیں اس میں انسان تو کم ملیں گے ہاں حیوان بہت۔ ذیل میں ایک جھلک ان معاشروں کی بھی پیش کی جاتی ہے جنہوں نے مرد و عورت کو بطور انسان بھی مساوی قرار نہ دیا۔

دل خون کے آنسو روتا ہے یہ سپردِ قلم کرتے ہوئے کہ دنیا میں ایسے غیر اسلامی اور غیر فطری معاشرے رہے ہیں (بلکہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں) کہ جن میں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی بوجہ زندہ درگور کر دیا جاتا رہا ہے۔ ”ستی“ کی رسم کہ جس میں زندہ بیوی کو مرنے والے خاوند کے ساتھ شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے کم ہی سہی لیکن کئی معاشروں میں آج تک موجود ہے۔ زیرِ آسمان عورت کو ہر معصیت وحشی گردانا گیا ہے۔ دنیا میں آج بھی جتنی طلاق شدہ عورتیں ہیں طلاق سے جدا ہونے والوں مردوں کی تعداد اس کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ گم گشتہ معاشروں نے تعددِ ازواج کا انکار تو کیا لیکن طلاق کو نئی شادیاں کرنے کے لئے بطور ہتھیار استعمال کیا۔ امریکہ جیسا ملک تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلا گیا۔ طلاق فی اور دی ہی اس لئے جاتی ہے کہ پھر شادی کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ تمام ضروریات جب بغیر شادی کے پوری ہو جاتی ہیں تو پھر شادی کی بندشیں گوارا کی جائیں تو کیوں؟ کئی ممالک میں تو عورت کو ایک ایسی نقد آور فصل کی شکل دے دی گئی ہے جس

کی برآمد درآمد ہوتی ہے۔ ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے ایسے کام رکھے جاتے ہیں جیسے کتوں اور بلیوں کے۔ "Marriage East & West" کا مصنف ایسے معاشروں کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جن میں عورت اور مرد کے کپڑے اکٹھے پانی میں نہیں ڈالے جاتے۔ ایک ہی بالٹی میں لے جائے نہیں جاتے اور ایک ہی تار پر سکھائے نہیں جاتے۔ عورت کے کپڑوں والی تار کو مرد کے کپڑوں والی تار سے نیچے رکھا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کے کئی مذاہب عورت کو گناہ کی دیوی تصور کرتے ہیں۔ ممنوع ہے کہ کئی مذہبی رسومات شادی شدہ مرد و عورت کو اس لئے کہ وہ عورت سے ملوث ہو کر پاک ہو گئے۔ ایسی رسومات کے لئے غیر شادی شدہ مردوں کو موزوں گردانا جاتا ہے۔ پندتوں اور راہبوں کی فوج ظفر موت جو کئی معاشروں میں گھر کر آئی ہے تو آخر اس کی کوئی وجہ تو ہے؟ کئی معاشروں میں بیوی کو خاوند کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی اجازت نہیں۔ عظم کی انتہا ہے کہ کئی معاشروں میں بیوہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ ایسے بھی معاشروں کی کمی نہیں جن میں عورت کے لئے پیٹ پالنے کے لئے کوئی آمد و مندا نہ راستہ نہیں۔ راستہ کھلا ہے تو ایک اور وہ راستہ ہے صحت فروشی کا۔ پھر ایک طرح کی ڈیوٹی کے لئے بھی اسے مرد سے آدھا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس بیچاری کو بچوں میں سے ایک بچہ سمجھا جاتا ہے۔ کئی شوہر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ میں بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں حالانکہ ان بچوں میں بیوی بھی شامل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو بیوی ہی بیوی ہوتی ہے بچوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ امریکہ میں چچی ایک کتاب بعنوان "The Underside of History" عورت کے مقام و حیثیت کو مرد کے مقابلے میں یوں بیان کرتی ہے:

Life	Death	Right	Left
Good	Bad	Male	Female
High	Low	Strong	Weak
Sacred	Profane	Day	Night

الغرض کس قدر بے ایمانک حیثیت ہے جو مختلف ادوار میں مختلف معاشروں نے عورت کو دی لیکن شومنی قسمت ابھی شاید اس بیچاری کے دن مزید گردش میں ہیں کہ رسی سہی کسر مغربی دنیا نے آج کے جدید دور میں

پوری کردی ہے۔ قدرت نے مرد و زن کی جسمانی ساخت اور جذباتی پرداخت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے مابین ایک موزوں ترقی قدرتی تقسیم کار کر رکھی ہے۔ مرد کا دائرہ کار اگر گھر سے باہر ہے تو عورت کا گھر کے اندر۔ ایسی تقسیم کار کسی مخصوص اعزاز کی وجہ سے نہیں پیدا کی گئی صلاحتوں کی وجہ سے ہے۔ مغرب والوں نے اس فطری تقسیم کار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عورت کو گھر کی سلطنت سے اٹھا کر بیرون خانہ مردوں کی طرح مشقت میں لگا دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے ”مساوات“ کا نام دے دیا۔ عورت پیاری فیکٹری یا کھیت میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ بچے بھی جنمے اور پالنے بھی لیکن مرد کی موت ہی موت، اپنے فرائض کا بوجھ بھی صلیب مازک پر ڈال دیا۔ یہ کیسی مساوات ہے؟ مساوات کا نام ہی دینا تھا تو پھر چاہئے تو یہ تھا کہ مرد بھی اپنی ازلی تقسیم کار یعنی کمانے کے ساتھ ساتھ بچے جنتا بھی اور پالتا بھی۔ عورت کی تقسیم کار کو بدلاتو وہ پھر بھی کسی طور ہی سہی نباہ کر رہی ہے مرد کے فرائض کو بدل کر دیکھیں مذکی کھائے گا نام کام و امراء ہوگا۔

دنیا کی آدمی آبادی سے زیادہ پر مشتمل اور افراط و تفریط کی شکار عورت کو اسلام قصر مذلت سے اٹھا کر بطور انسان مرد کے برابر لانا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ:

”جواب میں ان کے رب نے فرمایا! میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو“ (ایک سٹل پر ہو) (آل عمران: 195)۔

مرد ہو یا عورت ہر دو کو وراثت میں حصہ دار بنادیا۔ فرمایا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت حصہ (ہر دو کا) مقرر ہے“ (النساء: 7)۔

مرد و عورت کو مساوی قرار دیا تو اس حد تک جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پیسے، لازم و ملزوم۔ فرمایا: وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے (البقرہ: 87)۔

یہ تو ہے مرد و عورت کی وہ حیثیت جو اسلام ان دونوں کو بطور انسان دیتا ہے لیکن گھر کے ادارے کو چلانے کے لئے چوتھا ضروری تھا کہ دونوں میں سے ایک کو گھر کا سربراہ و نگران بنادیا جانا فہذا دو متبادل راستے

تھایک یہ کھڑکی سربراہی ونگرانی کا یہ منصب عورت کو دے دیا جانا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ یہ منصب مرد کو دیا جاتا۔ اسلام نے یہ منصب مرد کو تفویض فرمایا تو اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ مرد جسمانی طور پر عورت سے قوی ہے۔ اگر جسمانی طور پر کمزور کو قوی کا نگران بنادیا جائے تو آج بھی کوئی یہ تجربہ کر کے دیکھ لے، بیل کبھی منڈھے ہی نہ چڑھے۔ یہ منصب دیا تو بوجہ مرد کو دیا لیکن مرد کو یہ اعزاز مفت میں نہ دیا گیا بلکہ وہی فطرت نے شوہر و بیوی کے درمیان توازن اس طرح کیا کہ مرد کو عورت اور بچوں کے مان و نفع کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ صورت حال متوازن کی تو اس حد تک کہ شوہر اگر کسی وجہ سے عورت کو طلاق بھی دے دے تو مطلقہ بیوی کے جملہ اخراجات ایک وقت تک سابقہ شوہر کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔

پھر یہی نہیں بلکہ کھریلو نظام میں تو ماں کا درجہ باپ سے بڑھا ہوا قرار دیا۔ کھریلو نظام میں تین فریق ہوتے ہیں ماں باپ اور بچے۔ اس انتظامی یونٹ میں بغرض انتظامی امور مرد کو جیسے قوام یعنی نگران و مددگار ٹھہرایا گیا، اولاد کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ والدین کا احترام بھی کریں اور خدمت بھی۔ خدمت کے لحاظ سے ماں کو باپ پر ترجیح دی گئی۔ چنانچہ سورہ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے جہاں والدین کی شکرگزاری کا تاکید حکم دیا وہاں فوراً بعد یہ فرمایا ”اس کی ماں نے اس کو تکلیف پر تکلیف جمیل کر نو مینے تک اپنے حکم میں اٹھایا“ پھر دو سال تک اپنے خون سے اس کو پالا“ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں یوں آیا:

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”تیری ماں“ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”پھر تیرا باپ“ پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں“ (بخاری، مسلم)۔

ایک مسلمان کے لئے دنیا و آخرت میں جنت ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کو رب کائنات ”بڑی کامیابی“ قرار دیتا ہے۔ ایک طرف یہ بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی ہے اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ یہ ”جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے“۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جس حیثیت و مقام کا جو اسلام عورت کو بطور انسان، بطور بیوی اور بطور ماں دیتا

ہے۔ مرد و عورت کی ان مختلف حیثیتوں اور زمداریوں کو الٹ کر دیکھیں، منفی نتائج فوراً سامنے آئیں گے۔ کئی نادان معاشرے ایسے تجربات کر بھی چکے۔ بچتا وہی ان کا مقدّر ٹھہرا تو پھر کیوں نہ انسانیت ممنون ہو اسلام کی۔

اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا

جرائم پر دی جانے والی سزاؤں کو بھی اسلام کے مخالفین نے اکثر و بیشتر اپنے دلائل کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلامی سزائیں:-

☆ ایک تو بڑی ظالمانہ بلکہ وحشیانہ ہیں اور

☆ دوسرے یہ کہ یہ ساتویں صدی کے وحشی، بدوی اور غیر مہذب قبائل کے لئے وضع کی گئی تھیں لہذا آج کی مہذب دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔

پھر اس کے کہ ہم ان سزاؤں کے محاسن و قبائح کی طرف آئیں یہ جان لینا از بس ضروری ہے کہ اسلامی سزائیں واقعی بہت کڑی ہیں۔ مثال کے طور پر زنا کی سزا یہ ہے کہ:

”زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دینے کے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔“ (النور: 2)۔

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا یہ ہے:

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔“ (النور: 5)۔

چور کی سزا یہ ہے:

”اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت تاکہ سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و ہمایا ہے۔“ (المائدہ: 38)۔

انسانی اعضاء ضائع کرنے کی سزا:

”توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا بدلہ صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں“ (المائدہ: 45)۔

قتل کی سزا یہ ہے:

”اور کسی مومن کے لئے رہا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذاتہ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یا اللہ کی طرف سے اس گناہ پر توبہ کرنے کا طریقہ ہے۔ اللہ علیم و حلیم ہے۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمدتاً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے“ (النساء: 92-93)۔

اسلامی نظام حکومت کو درہم برہم کرنے کی سزا:

”جو لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سوئی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کائے جائیں یا وہ بلا وطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قتل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“ (المائدہ: 33-34)۔

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ سزائیں جن کا اوپر ذکر ہوا سخت بھی ہیں اور شدید بھی لیکن سخت اور

کڑی ہونے کے علاوہ ان کے درج ذیل تین اور اوصاف بھی ہیں جن کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اسلامی سزائوں کی نوعیت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

- 1- یہ سزائیں آخری چارہ کار ہیں۔
 - 2- یہ سزائیں جرائم کے راستے میں بھاری پتھر ہیں (Deterrent) ہیں۔
 - 3- یہ سزائیں اصلاحی (Reformative) ہیں۔
- ضرورت ہے کہ اسلامی سزائوں کے ان تین پہلوؤں کو ذرا تفصیل سے زیر بحث لایا جائے۔

سزائیں بطور آخری چارہ کار

ایسا نہیں ہے کہ اسلام متناہی رہتا ہو کہ کوئی مجرم ہاتھ لگے تاکہ اسے سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اسلام کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا اس کوشش میں کہ کوئی جرم کرنے ہی نہ پائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس کھیت میں تم چاہتے ہو کہ کوئی چرنے والا مویشی منہ نہ مارے اسے اس کھیت کے نزدیک چرنے ہی نہ دوتا کہ اسے منہ مارنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مثال کے طور پر فعل زنا کو روکنے کے لئے اسلام جو ان گنت رکاوٹیں اور مشکلات اس رجحان کے راستے میں حائل کرتا ہے کہ جو بالآخر اس فعل پر منع ہوتی ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

☆ بدکاری کے راستے میں سب سے بڑی چٹان جو اسلام رکھتا ہے وہ آخرت میں جواب دہی کا تصور ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہر فرد کا ہر فعل 'جھومنا' ہو یا بڑا ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اس کا یہ ریکارڈ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ قیامت کو ہر فرد کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھا جائے گا اور اسے کہا جائے گا کہ آج تو اپنا محتسب خود ہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر کسی بھی فرد کا کوئی بھی عمل اچھا ہو یا برا دنیا کی کسی عدالت کے نوٹس میں نہ آئے تو نہ آئے قیامت کے دن جزا و سزا کی چھلنی سے ضرور گزرے گا۔ جزا کی صورت میں صاحب عمل کو جنت میں داخلہ ملے گا اور سزا کی صورت میں دوزخ میں۔

☆ خوف خدا اور آخرت کی اس 'بڑی روک' کے علاوہ جو بطور پولیس چوکی ہر مسلمان کے دل میں ہر وقت جاگزیں رہتی ہے اسلام ہر وہی رکاوٹیں بھی کھڑی کرتا ہے۔ یہ رکاوٹیں مزید دو طرح کی ہیں۔

ایک پہلو تو مثبت رکاوٹوں کا ہے یعنی اسلام ہر فرد کو شادی کی ترغیب دیتا ہے اور مجرد رہنے کو پسند نہیں کرتا اور دوسری رکاوٹیں اپنے اندر منفی پہلو رکھتی ہیں یعنی وہ گناہ کے راستے کا پتھر بنتی ہیں۔ جہاں تک شادی کرنے کی ترغیبات کا تعلق ہے ان میں سے چند درجہ ذیل ہیں۔

- غیر شادی شدہ رہنا اسلامی تعلیمات کے مطابق احسن نہیں گردانا گیا۔ قرآن و سنت میں شادی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک تو یہاں تک ہے کہ جو کوئی شادی کرتا ہے، آدھا دین مکمل کر لیتا ہے۔

- رہبانیت اور تحرر کی کوئی گنجائش نہیں۔

- بیوہ کو دوبارہ شادی کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔

- اگر کوئی جوڑا ایک دوسرے سے ملاں ہو جائے تو طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ طلاق کا حق شوہر اور بیوی میں سے کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے گواہی کا طریق کار ذرا مختلف ہے۔

- جلد شادی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان بایں کو آخرت میں انعامات سے نوازا جائے گا جو اپنی بیٹیوں کی شادی بلوغت ہوتے ہی کر دیں۔

- جائز ازدواجی تعلقات کو عبادت گردانا گیا ہے۔

بہرہ فی رکاوٹوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں مردوں اور عورتوں کے عمومی اختلاط کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسی چند بندشیں درج ذیل ہیں

- بدکاری اور زنا کے لئے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔

- عورت کے دائرہ کار کو زیادہ تر گھر کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا گیا ہے۔ کبھی کبھار اگر اسے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہو تو اسے شائستگی کا دامن تھامنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں اور منہ کے کچھ حصوں کے علاوہ پورے جسم کو ڈھیلی دھلی چادر سے ڈھانپ کر رکھے۔ کسی قسم کی زینت کی نمائش نہ کرے۔ زیورات پہنے تو ایسے کہ جن کی کوئی جھٹکار وغیرہ نہ ہو۔ کسی سے بات کرے تو مضبوط طور پر نہ کہ لوجھار لہجے میں کرے۔

- محرم اور غیر محرم رشتوں کی باقاعدہ تقسیم و تخصیص کی گئی ہے۔ محرم رشتے وہ ہیں جن کے ساتھ کسی عورت کی شادی ممنوع ہے جیسے باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ۔ تمام وہ رشتے جن کے ساتھ شادی کی اجازت دی گئی ہے محرم کی فہرست میں آتے ہیں۔

- ایسی محفلوں، مجلسوں اور نشستوں میں مسلمان مرد و عورت کی شمولیت ممنوع جو محرموں پر یا محرموں اور محرموں دونوں پر مشتمل ہوں۔

- کوئی غیر محرم مرد اور غیر محرم عورت تنہائی میں نشست نہیں کر سکتے۔

- ہدایات دی گئی ہیں کہ عورتیں اور مرد جب آئے سامنے گزریں تو نظریں نیچی رکھیں۔ ثبوت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنا گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمانا تو یہاں تک ہے کہ غیر محرم مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے (پہلی سرسری نظر پر جائے تو اہلہ معاف ہے)۔ غیر شائستہ گفتگو زبان کا زنا ہے۔ بے ہودہ اور ثبوت بھری سماعت کانوں کا زنا ہے۔ غیر محرم کو چھونا اور اس کی طرف عیاں شائستہ پیش رفت ہاتھوں اور پاؤں کا زنا ہے۔

- اسلام گھریلو خلوت اور رازداری (Privacy) پر بہت زور دیتا ہے۔ بغیر اجازت کسی دوسرے کے گھر داخل ہونے کی اور گھر کے اندر جھانکنے کی قطعاً ممانعت ہے۔ کسی دوسرے کے گھر میں داخلے کے لئے تین دفعہ اجازت مانگنے کے باوجود اگر جواب نہ ملے اور اگر ملے تو معذرت کا تو پھر واپس جانا ہوتا ہے۔ اجازت لینے وقت کسی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ اپنے ہی گھر کے مبالغوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ تین اوقات یعنی صبح کی نماز سے پہلے، گرمیوں میں دوپہر کے وقت جب زیادہ تر کپڑے اتارے ہوتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد مبالغوں کے کمروں میں نہ جائیں۔ دوسروں کے خطوط ان کی اجازت کے بغیر پڑھنا ممنوع ہے۔ صرف دوسروں کے ہی نہیں بغیر اجازت کے ماں اور بہن کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

- اسلام جب محرموں کو چھوٹے مجلسوں اور رو برو گفتگو کرنے کی ممانعت کرتا ہے تو ظاہر ہے چھوٹے تعلیم، چھوٹے کاروبار، چھوٹے اور مشترکہ رہائش وغیرہ کا قطعاً کوئی سوال نہیں۔

- ان تمام بندشوں کے علاوہ اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ مسلم معاشروں کا عمومی اور مجموعی ماحول خدا ترس، بھائی چارے اور خیر خواہی کا مظہر ہو۔ جنسی انواہوں، خش گانوں، پھر تصویروں، ناچ وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ تہمتیں داغنا تو اس قدر گناہ گردانا گیا کہ تقریباً تقریباً جیسے بدکاری و زنا۔ اندازہ لگائیں اس ماحول کا کہ جس میں بعض حالتوں میں آنکھوں دیکھے زنا کاروں کا بھی اس وقت تک انکشاف نہیں کیا جائے گا جب تک کہ چار گواہ نہ ہوں۔

رکاوٹوں، مزاحمتوں اور بندشوں کا یہ بحر پور بندوبست صرف ایک جرم یعنی زنا کو روکنے کے لئے کیا گیا۔ دوسرے بڑے بڑے جرائم کی راہ میں بھی اسی طرح کی بندشوں کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ قرآن و سنت نے حائل کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے ان بحر پور رکاوٹوں اور بچاؤ کی ترغیبوں کے علی الرغم اگر پھر بھی کوئی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ جیسا گلاہڑا پھل ہے کہ جس کا درخت پر رہنا تندرست پھلوں کے ساتھ انتہائی ظلم و زیادتی ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے گلے سڑے پھل کو صرف درخت سے علیحدہ ہی نہ کیا جائے بلکہ اسے اس طور مردہ، کچلا اور زیر زمین دفن کر دیا جائے کہ اس کی ہوا تک تندرست پھلوں کو نہ لگے۔ اسی طرح ایک ایسا فرد جو ان تمام رکاوٹوں اور ترغیبات کے باوجود گناہ کا ارتکاب کرتا ہے بظاہر تو چلتا پھرتا انسان ہوتا ہے حقیقتاً ایک ایسی لاش ہوتا ہے جس کی انسانیت طبعی موت سے بہت پہلے مر چکی ہوتی ہے۔ ایسی لاش کو زندہ انسانوں کے درمیان رہنے دینا معاشرے اور انسانیت پر ظلم ہے۔ دس فطرت ایسے ظلم کی کیسے اجازت دیتا؟

اسلامی سزاؤں کا مزاحمتی پہلو

اس میں کسی کو کوئی کلام نہ ہو گا کہ انٹیم بم ایک انتہائی بھیا تک، مہلک اور تباہ کن ہتھیار ہے لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس دنیا میں اس کا موجود ہونا عالمی جنگ کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ (Deterrent) ہے۔ اسی طرح اسلامی سزاؤں کا بظاہر سخت اور کڑا ہونا تو ایک مسلمہ امر ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کا یہی بظاہر سخت اور بھیا تک ہونا جرائم کے راستے کا بھاری پتھر ہوتا ہے۔ جرم کرنے والے کو سوبار سوچنا پڑتا ہے کہ کیا وہ ان سزاؤں کا تحمل ہو سکتا ہے؟ ان سزاؤں کے کڑا ہونے کی افادیت تو اب تجربے سے بھی عیاں ہے۔ ایسے ممالک میں خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، جہاں اسلامی سزائیں نافذ

نہیں جرائم کا تناسب سعودی عرب سے کئی گنا زیادہ ہے کیونکہ سعودی عرب میں اسلامی سزائیں عملاً نافذ ہیں۔ کسی بھی نظام کی خوبی تو یہی ہو سکتی ہے کہ جرائم کی وجہ سے وہاں انسانی جانوں کا ضیاع کم سے کم ہو۔ سعودی عرب میں ان جانوں کا ضیاع جو جرائم کی وجہ سے ہوتا ہے یا جرائم کی سزا کے طور پر وارد کی جاتی ہیں کی تعداد امریکہ میں انہی مہلات میں ضائع ہونے والی جانوں کا عشر عشر بھی نہیں۔ بتائیے ظالمانہ و وحشیانہ سزائوں کا نظام امریکہ میں ہوا یا سعودی عرب میں؟ کس قدر ضرورت ہے انسانیت کو اسلام اور اسلامی سزائوں کے نفاذ کی؟

اسلامی سزائوں کا اصلاحی اور تہمیری پہلو

گلے سڑے انسان کو ٹھکانے تو لگایا ہی ہوتا ہے لیکن اسلام کی یہ عظمت و اعزاز دیکھئے کہ وہ اس ضائع کی جانے والی انسانی جان سے بھی فائدہ اٹھانا لازمی سمجھتا ہے۔ اسلام اس مقصد کو کئی پہلوؤں سے حاصل کرتا ہے جن میں سے کم از کم تین کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں:

1۔ اسلام ایسا نہیں کرتا کہ مجرم کو رات کے اندھیرے اور کسی کال کو فحش میں سزا دے دے۔ بلکہ اکثر و بیشتر وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مجرم کو کھلے عام سزا دی جائے اور سزا دیتے وقت عوام کا ایک ہم غصہ موجود ہونا کہ دنیا کے انسان بہ چشم سر دیکھ لیں کہ جرم کرنا کتنا منکرا ہے۔ اسلام کا یہ کہنا کہ سزا دیتے وقت سزا دینے والوں کے دل میں مجرم کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہونا چاہئے اسی لئے کہ کہ درس عبرت حاصل ہو تو مکمل اور حتیٰ باتھ پاؤں کا کاٹنا بھی اسی لئے ہے کہ باتھ پاؤں کاٹنا جرح سے بھی گزرے تو ساتھ ساتھ یا شہتہ بھی لئے پھرے کہ چوری کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟

2۔ باتھ کٹوائے جانے والے شخص کے لئے باتھ کے کتنے سے لازم نہیں آتا کہ اس کے نفس کی اصلاح بھی ہو گئی ہو۔ لہذا اسلام کی رو سے باتھ پاؤں کا غارہ دے دینے والوں سے بھی آخرت میں جرم کے بارے میں مزید باز پرس ہوگی۔ ایسی باز پرس سے چھٹکارا ممکن ہے بشرطیکہ مجرم اس دنیا کی سزا پانے کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے اور سچی توبہ کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی اس قدر اصلاح ہو چکی ہو کہ باقی عمر میں پھر کبھی اس سے وہ جرم صادر نہ ہو۔ یہی مطلب ہے یہ کہنے کا کہ ”مجرموں کی شہادت قبول نہ کرو سوائے ان

لوگوں کے کہ جو (مجرمانہ) حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔“

3۔ اسلام مجرموں کو مایوس نہیں کرتا کہ وہ اپنے اندر یہ احساس لیے ہوئے رہیں کہ اب وہ سوسائٹی میں ہمیشہ کے لئے عضوِ فاسد ہیں۔ وہ ہزا پانے والوں اور تائب ہوجانے والوں کو معافی کی بنا رت دیتا ہے۔ یہ ایسی ہی بنا رت کے حصول کا مظہر تھا کہ زیرِ آسمان کئی مجرم جو انسانی نگاہ سے بچ گئے ہزا پانے کے لئے خود ماضی ہوتے رہے۔ بہت سی آیات جن میں اسلامی قوانین کی مزایا بیان ہوئی ہیں وہی وجہ سے ایسے الفاظ سے ختم کی گئی ہیں جیسے ”اللہ غفور ورحیم ہے“ ”اللہ دانا و عیا ہے“ وغیرہ۔ ایک جگہ پر تو ایسے الفاظ آئے کہ ”جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر تاقبوا پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

مذکورہ بالا بدلیات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام مجرموں کو محض ہزا دینے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اسے ہزا دینے سے بھی زیادہ معاشرے سے مجرمانہ ذہنیت ختم کرنے کی فکر دامن گیر ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی ہزاؤں کا اصل ہدف معاشرے کی اصلاح و تعمیر ہے۔ کیا انسانیت کو اصلاح و تعمیر کی ضرورت نہیں؟

اسلامی جہاد (مسلم جدوجہد) کیوں؟

جیسا کہ ذکر ہو چکا اسلام ہے ہی ایسے احکام اور اوامر و نواہی پر مشتمل کہ جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں۔ اس بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ اسلام میں کوئی نقص ہے بلکہ اس لئے ہی ہوگی کہ وہ خود بخود لے پن اور نادانی میں اسلام کی حقانیت کو سمجھنے میں تاصر رہا ہے ورنہ یہ مسلمہ امر ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے کہ جو پوری انسانیت کے لئے بھلائی اور خیر خواہی کا ضامن ہے۔ اسلام کا ایسے ہونا اس لئے لازمی امر ہے کہ یہ دین انسانوں کا بنایا ہوا ہے نہیں بلکہ انسانوں کے خالق کا بنایا ہوا ہے۔ بندے اگر یہ ضابطہ حیات بناتے تو وہ ضرور طبقاتی، گروہی، نسلی اور علاقائی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر بناتے جیسا کہ پوری انسانی تاریخ میں بنائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی بنائے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے جو ضابطہ حیات علاقائی یا طبقاتی ہوگا انسانیت کے لئے کس طرح قابلِ عمل ہو سکتا ہے؟ اسلامی ضابطہ حیات کا اعزاز ہی یہ ہے کہ وہ اس خالق و مالک و مالک کا بنایا ہوا ہے جو رب کائنات ہے، جو غیر جانبدار ہے، جو کسی جرم

کارب ہے تو کسی مصری کارب بھی جو کالے کارب ہے تو گورے کارب بھی جو مرد کارب ہے تو عورت کارب بھی جو اس وقت بھی موجود تھا جبکہ پہلے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا آج بھی موجود ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے موجود رہے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک فیکٹری والے کو جیسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری کے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کی ہدایات دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسان کے لئے ضابطہ حیات وضع کرے اس لئے کہ انسان فیکٹری کا ہی تو پروڈکٹ ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام پوری انسانیت کے لئے ضابطہ حیات ہے تو اسے اس انسان کا بھی ضابطہ حیات ہونا چاہئے جو اس دنیا میں پہلے پہل وارد ہوا تھا۔ ان انسانوں کے لئے بھی جو آج اس دھرتی پر موجود ہیں اور ان انسانوں کا بھی جو قیامت اس دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ کیا ہی مطابقت ہے کہ واقعات کی دنیا میں ایسا ہی ہے اس دنیا میں پیدا ہونے والا پہلا شخص حضرت آدم خود بنی تھا۔ بذریعہ وحی اس کا براہ راست رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا۔ پھر جتنے انبیاء و رسل اس دنیا میں وقتاً فوقتاً آتے رہے وہ ایک ہی سرچشمے سے منسلک تھے، ایک ہی ضابطہ حیات یعنی اسلام کے طہر و دار تھے اور بالآخر انہیں ایک ہی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ مختلف ادوار میں کچھ امتیں اپنی نسبت اور تشخص کو جاگر کرنے کے لئے اس ”ایک ضابطہ حیات“ کو یہودیت، عیسائیت وغیرہ کے سے نام دیتی رہیں ورنہ ازل سے اب تک اس ضابطہ حیات کا نام اسلام ہی ہے اور جو اس ضابطہ حیات کو اختیار کرے اسے ہمیشہ مسلمان یعنی اللہ تعالیٰ کے مطیع فرمان کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن میں آیا:

”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے بہت کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طریقہ عمل کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی“ (آل عمران: 19)۔

پھر چونکہ یہ تمام انبیاء ایک ہی ہستی کے نمائندے اور ایک ہی سرچشمے کے ترجمان تھے لہذا فرمایا گیا کہ وہ ایک ہی برادری کے لوگ تھے ان میں اور ان کتابوں میں جو وہ لائے کوئی فرق نہ کیا جائے بلکہ ان تمام پر

ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے کہ اس نئی پر جو وقت کا نئی ہو قرآن میں آیا:

”مسلمانو! کیونکہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف مازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم
، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف مازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام
پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے
مسلم ہیں“ (البقرہ: 136)۔

ہم مسلم کے متعلق یوں بھی فرمایا:

”اللہ نے پہلے ہی تمہارا نام ”مسلم“ رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی“ (الحج: 78)

جب اسلام پوری انسانیت کا ازل سے اب تک دین ہے تو ایک اور سوال کا ذہن میں آنا ضروری ہے
اور وہ یہ کہ پھر اس کی تعلیمات و ہدایات وقت کے کسی بھی موڑ پر ان تمام انسانوں تک پہنچنی چاہئیں جو کہ اس
وقت موجود ہوں تاکہ وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی اس دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات کا بندوبست
کر سکیں۔ واقعات کی دنیا میں ایسا ہی ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ جو انبیاء و رسل آتے رہے تو اسی وجہ
سے کہ وہ اللہ کے دین کو اس دھرتی کے کینوں تک پہنچاتے رہے۔ پھر چونکہ یہ پہنچانے کا کام اتنا اہم تھا کہ
لوگوں کی نجات کا دار و مدار اسی پر تھا کہ وہ ان تعلیمات پر عمل کریں لہذا اس پہنچانے یا رسالت کے کام کو انبیاء و
رسل کو بطور جنتیج دیا گیا۔ یہ رسالت کا کام آج تک بلکہ قیامت جاری رہے گا کیونکہ ہر موجودہ اور آنے
والے انسان کی یہ اسی طرح ضرورت ہے جیسے کہ اس انسان کی تھی کہ جو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ البتہ اس
پہنچانے کے کام میں اس قدر فرق ضرور پڑ گیا کہ سلسلہ نبوت ختم کر کے یہ کام اللہ تعالیٰ نے آخری امت یعنی
مجتہد مسلمہ کے سپرد کر دیا۔ بالفاظ دیگر مجتہد مسلمہ اب نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی حامل و محافظ
ہے بلکہ یہ رسالت کا کام کرنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ اصل میں وہ آسمانی ہدایات جو پہلے جزوی طور پر آتی تھیں
قرآن کی شکل میں حتمی اور مکمل کر دی گئیں لہذا ”یہا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ انبیاء و رسل کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم
کر دیا جاتا۔“

اب مسلمانوں کو یہ پہنچانے کا کام اس لئے کرنا ہے کہ یہ ان کا فرض منصبی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی

نجات بھی ممکن ہے کہ وہ اس اہم ترین فرض کو بطریقہ احسن ادا کریں۔ دوسروں تک ان تعلیمات کا پہنچنا اس لئے ضروری ہے کہ ان کی نجات کا دار و مدار انہی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہے۔ ایک پتے کی بات یہ کہ پہنچانے کا کام بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام اور اسلام والے دنیا میں بطور غالب قوت موجود ہوں۔ بصورت دیگر ان پہنچانے والوں سے بڑھ کر اگر کوئی اور طاقت موجود ہوگی تو وہ یہ کام کرنے ہی نہ دے گی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ فرض کریں ایک طرف کسی آدمی کے پاس کنواں اور کنوئیں سے پانی نکالنے کا پورا انتظام ہے اور دوسری طرف کچھ فاصلے پر بہت سے پیا سے ہیں۔ کنوئیں والا چاہتا بھی ہے کہ وہ جلد از جلد پیا سوں تک پانی پہنچائے لیکن راستے میں کسی طاقت ور زمیندار کی زمین پڑتی ہے اور وہ فتنہ کھڑا کر دیتا ہے کہ اس کی زمین سے گزر کر کوئی دوسری طرف پانی نہیں لے جاسکتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی ہولناک صورت حال کا کیا حل ہو؟ ہر سلیم الطبع انسان فوراً یہی فیصلہ دے گا کہ انسانی جانوں کو بچانے کی خاطر مزاحم ہونے والے بہت دھرم زمیندار سے کم از کم اس طاقت کو چھین لیا جائے کہ جو انسانوں کے لئے وبال جان بن گئی۔ ہو یہ بھی صورت اسلامی جہاد کی ہے۔ اسلامی جہاد دنیا کے مادی فائدے حاصل کرنے کے لئے قطعاً نہیں۔ اگر کوئی مادی فوائد بٹورنے کے لئے کرے تو خود قیامت کو پکڑ جائے گا۔ اسلامی جہاد صرف اس لئے ہے کہ گمراہ انسانوں سے وہ طاقت چھین لی جائے کہ جو دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے کا باعث ہو اور ماحول کو اس قدر سازگار بنا دیا جائے کہ اسلامی تعلیمات پہنچانے کے راستے میں کوئی فتنہ کھڑا نہ کر دے۔ مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار ہی اس وقت کیا جاتا ہے جب مزاحم قوتیں دعوت و تبلیغ کے ذریعے رسالت کے کام کو ناممکن بنا دیں۔ کسی انسان پر سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ آسمانی ہدایات کو اس تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ جس فطرت ایسے ظلم کو کیسے برداشت کرتا؟

چونکہ اسلامی جہاد نہ مادی فوائد بٹورنے کے لئے ہے اور نہ ہی کسی کو مجبوراً مسلمان کرنے کے لئے (۱) اکراہ فی الدین لہذا اس کے ساتھ فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسلامی جہاد کی اسی فی سبیل اللہ شرط کا اعزاز ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اس جہاد کے ذریعہ اتنی جانیں تلف نہیں ہوئی جتنی کہ مثال کے طور پر دو میں سے ایک عالمی جنگ میں۔ یاد رہے غزوہ رسول اللہ ﷺ میں کل 7323 جانیں قتل و زخمی یا سیر ہوئے۔ اسی دوران محض 387 مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے برعکس صرف جنگ عظیم اول کے متولین کی

تعداد 7469700 بحر چین کی 19432000 اور قیدیوں کی 6526500 تھی۔ جنگ عظیم دوم میں ان اعداد و شمار سے بھی کئی گنا زیادہ تعداد متاثرین کی تھی۔ کن اتفاق میں اس حقیقت کو بیان کیا جائے کہ اسلامی جنگ انسانیت کی خاطر جدوجہد ہے تو غیر اسلامی جنگ محض فساد ہے۔ ایک جنگ انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضامن ہے تو دوسری انسانیت کی ویرانی و بربادی کا ذریعہ۔ ایسے میں کیا رتی بھر بھی کوئی شک ہے کہ ”اسلام پر یلغار اصل میں انسانیت پر ظلم ہے۔“ کاش اس دنیا کے مکین اپنا برا بھلا پہچانیں۔

جیسا کہ ثابت ہو چکا اگر تعدد و ازواج، مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات، اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے متنازع موضوعات انسانیت کی بھلائی و خیر خواہی کے لئے ہیں تو پورے اسلام کی برکات و فیوض کا اندازہ لگائیں۔ یہ محض تصوراتی معاملہ ہی نہیں تاریخ شاہد ہے کہ اس گیارہ سو سالہ دور میں جب اسلام اس دنیا میں بطور غالب قوت موجود رہا صرف انسانوں ہی نے سکھ کا سانس نہ لیا، پرندوں اور چرندوں کا مقدر جاگ اٹھا۔ کسی کی کیا مجال کہ اس دور میں کسی دوسرے پر بھی زیادتی کرتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حکمرانوں نے اپنے آپ کو نادموں کی سطح پر رکھا اور آخرت کی باز پرس کا خوف انہیں اس قدر مشکوک رکھتا کہ وہ خود تو بھوکے نٹے رہے لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ”فراات کے کنارے کوئی بکری کا بچہ تک بھوکا رہے۔“

آج انسانیت اسلام کی برکات سے محروم ہے تو اس وجہ سے کہ وہ امت جس نے اسلام کو دوسروں تک پہنچانا تھا خود اپلیت کا شکار ہو کر دنیا میں مغلوب و مجبور ہو گئی۔ جس امت نے اس دنیا کو سنوار کر رکھنا تھا خود تباہی و بربادی کا شکار ہو گئی۔ بحر و بر میں شر اور فساد نے ڈیرے آجائے تو اس کی کوئی تو وجہ ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کو انسانیت کی ضرورت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انسانیت کو اسلام کی بہت ضرورت ہے۔

یہ لاڈ، یہ عطا، آخر کیوں؟

دو پودے ایک مصنوعی ریشتے سے کسی مشین میں بنایا گیا اور دوسرا قدرت کی فیکٹری یعنی کھیت کا پلا پوسا۔ دیکھنے میں دونوں ہو بہو ایک جیسے لیکن حقیقتاً دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تفرق کیوں نہ ہو ایک کو محض چند نمکیات گوند کر بنایا گیا جب کہ دوسرے کی نمود و پرورش پوری کائنات کی مہربان منت۔ سورج کو زمین سے اتنے فاصلے پر رکھا گیا کہ حرارت میسر ہو تو اتنی کہ نہ پودے کو جلا کر رکھ دے اور نہ ہی اسے ٹھنڈ کر دے۔ پھر پودے کو محض حرارت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اسے تو روشنی بھی درکار ہے۔ پودے کی خوراک جو پتوں میں تیار ہوتی ہے اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتی جب تک کہ پتوں میں موجود ہیزی مائل مادہ یعنی کلوروفیل روشنی سے مل کر خوراک نہ پکائے۔ کسی پودے کو چند دن اندھیرے میں یا چھاؤں میں رکھ دیں پتے زرد پڑ جائیں گے مناسب خوراک نہ بن سکے گی تو پودا پہلے کمزور ہوگا پھر ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔ پودوں کو یہ روشنی فراہم کرنے کی خاطر سورج کی رسانی دنیا کے ہر خطے میں ممکن بنادی۔ سورج اور زمین کی گردش کو یوں مرتب و منظم کیا کہ دن اور رات باری باری معرض وجود میں آتے ہیں تاکہ پودے کو حرارت و روشنی بھی میسر ہو اور خشکی و شبنم بھی۔

پودے کو تو پانی کی بھی ضرورت ہے اور ضرورت بھی اتنی کہ پودے کی ساخت میں ۹۸ فیصد تک پانی اور باقی خشک مادہ ہوتا ہے۔ دنیا میں پانی کے بغیر زندگی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے پانی کا ذکر سر فہرست کیا ہے۔ پانی کی اتنی بڑی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر کرۂ ارض کی ساخت کو تین چوتھائی حد تک ٹھانڈا کرتے ہوئے سمندروں پر مشتمل کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے سمندروں میں پانی کس کام کا کہ پودا تو شاید ہزاروں میل دور کسی چینیل میدان میں ہو۔ خالق کون و مکان نے سورج کی حرارت کو ہی استعمال کیا تاکہ بخارات بنیں اور وہ بھی اس طرح کہ یہ بخارات سمندر کی کٹافٹوں سے پاک ہوں۔ یہ بخارات اگر کہیں سمندر پر ہی مطلق رہیں تو پودے کے کس کام کے؟ ہوا

سے ان بخارات کی بار بار داری کا کام لیا اور وہ اس طرح کے میدانوں کی ہوا چونکہ خشک اور ہلکی ہوتی ہے لہذا ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ پیدا شدہ خلا کو پر کرنے کیلئے بخارات بھری بھاری ہوا میدانوں کی طرف لپکتی ہے۔ پھر ایک اور مرحلہ کہ بخارات تو ابھی نہیں، اگر خشک ہوں۔ پہاڑ بنادینے کے بخارات ان سے ٹکرا کر اوپر چڑھیں۔ یوں بارش کا انتظام کر دیا، لیکن یہ بھی ایک مشکل کہ بارش بعض اوقات ہو ہی نہیں پاتی، متبادل انتظام کے طور پر نہ صرف دریا اور نہروں کا جال بچھا دیا بلکہ زیر زمین پانی کے وافر ذخائر مہیا کر دیئے۔ پھر زمینی ذروں کو شعری حرکت (Capillary Movement) کی استعداد عطا کر دی تاکہ زیر زمین پانی خود چل کر پودے کی جڑوں تک پہنچے۔

پودے کو سانس بھی لینا ہوتا ہے۔ پانی بغیر تو شاید چند دن گزارا ہو جائے سانس لیے بغیر تو فوراً ہر مزدی طاری ہو جاتی ہے۔ خالق کائنات نے ہوا کی اسی اہمیت کے پیش نظر زمین کے ارد گرد میلوں تک ہوا کا غلاف چڑھا دیا ہے۔ پھر پودے کو محض ہوا کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اسے تو آکسیجن ہائیڈروجن کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری کئی گیسوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ لہذا ہوا کی ساخت میں نہ صرف ان تمام گیسوں کو فراہم کر دیا بلکہ ان گیسوں کو یوں مناسب مقدار میں کر دیا کہ ہوا پودے کے لیے مسموم ہونے کی بجائے خوشگوار ہو۔

پودا ہوا میں مطلق نہیں رہ سکتا، اسے تو کسی جائے قرار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وسیع و عریض زمین فراہم کر دی کہ نہ صرف جائے قرار کا بندوبست ہو بلکہ پودے کی غذائی ضروریات پوری ہوں۔ غذا کا انتظام بھی اس تناسب کے ساتھ کیا کہ مختلف غذائی عناصر میسر تو ہوں لیکن اس مقدار میں کہ پودے کیلئے مضرت نہ ہوں۔ یاد رہے تھور زدہ زمینیں اس لیے بھیتی مازی کے قابل نہیں رہتیں کہ ان غذائی عناصر کا باہمی تناسب ماموزوں ہو جاتا ہے۔ پھر زمین کو پتھر کی طرح سخت نہیں بلکہ مسام دار بنایا گیا تاکہ جڑیں سانس لے سکیں۔ سیم زدہ زمینیں اس لیے قابل کاشت نہیں رہتیں کہ پانی کی وافر موجودگی جڑوں کو اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ باسانی سانس لے سکیں۔ چونکہ زمین میں پودوں کی خوراک ہر لمحہ مطلوبہ مقدار میں تیار نہیں ہوتی اور اگر ہو تو فصلیں اگانے سے صرف ہوتی رہتی ہے لہذا زمین میں ان گنت قسم کے بیج پھیلے پیدا کر دینے تاکہ خوراک کے محلول کی سپلائی منقطع نہ ہو۔ یہ محلول اگر پتوں تک نہ پہنچے جہاں سورج کی روشنی میں خوراک پکنا ہوتی ہے تو اس کی محض

موجودگی کس کام کی؟ جڑوں، تنے اور شاخوں کو ایسی ساخت دے دی تاکہ بقدر ضرورت یہ پھول پتوں میں پہنچتا رہے۔

پوری کائنات میں اربوں نظامِ شمسی فراہم کر دیئے جن میں سے ایک وہ نظامِ شمسی ہے جس کا واسطہ ہم دنیا والوں سے ہے۔ اس نظامِ شمسی میں اربوں ستارے اور سیارے ہیں لیکن یہ سعادت صرف زمین کو حاصل ہے کہ زمین ان تمام ستاروں اور سیاروں کی توجہ کے مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی سیارہ حرارت و روشنی فراہم کرتا ہے تو کوئی خشکی و رطوبت، کوئی نیل و نہار لانے میں مدد و معاون ہے تو کوئی مد و جزر کا باعث بنتا ہے۔ ایک ہی زمین، ایک ہی شکل کا پودا لیکن پھلوں اور پھولوں کا رنگ مختلف یہ رنگ کہاں سے آتے ہیں؟ مختلف سیارے ہی تو یکا رامہ سرانجام دیتے ہیں۔

اندازہ کیا آپ نے کائنات کا ذرہ ذرہ مصروف و مشغول ہے تو پودے کی صحت مندانہ نمو پرورش میں۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ ستارے، یہ سیارے، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ پانی، یہ ہوائ، یہ زمین، یہ نیلگوں، آسمان، ایک ایک لحوہ صرف کر رہے ہیں تو پودے کو لاؤ لڈانے میں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے اہتمام اور اتنی محنتوں اور شہتوں سے تیار ہونے والا پودا کس کے لیے ہے؟ ارض و سماجیران و ششدر کہ پودے کو یوں تیار کیا جاتا ہے تو اس حقوق کیلئے کہ جسے اللہ تعالیٰ یاد کرتا ہے تو یوں کہ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“ اور پھر قسم فرمایا تو یوں کہ ”ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا“۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ پودے پر صرف انسانی زندگی کا انحصار ہی نہیں، چمند پرند، حیوان وغیرہ زندہ ہو موجود ہیں تو پودے ہی کی وجہ سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پودے پر ہی یہ دوسری مخلوقات برحق چلتی ہیں لیکن اس سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب دوسری مخلوقات بھی تو انسان ہی کیلئے ہیں۔ جیسے انسان چاہے ان کو استعمال میں لائے۔ مل چلانے کے لیے، سواری کیلئے، بار برداری کیلئے، دودھ حاصل کرنے کیلئے، اون حاصل کرنے کیلئے، صدق یہ ہے کہ پیٹ بھر نے کیلئے گوشت درکار ہے تو انہیں ذبح کرے اور لذت لے۔ ٹھہلی کا گوشت، پیڑے کا گوشت، بکری، دنبہ، گائے، بھینس، اونٹ وغیرہ کا گوشت، مرغ، مینک، جو من مانگے کھائے۔

اندازہ لگایا آپ نے رب کائنات نے پوری کائنات کو انسان کے قدموں میں ڈھیر کر رکھا ہے۔ عطا کیا تو اس قدر کہ اگر انسان اپنے رب کی نعمتوں کا شکر کا شروع کرے اور اپنی پوری حیات گزارے تو خود

ختم ہو جائے نعمتوں کو شمار نہیں کر پائے گا۔ اسی حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا:

”وہی اللہ ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسائی کیلئے طرح طرح کے پھل پیدا کئے۔ جس نے کشتی کو مسخر کیا تو تمہارے لیے کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو مسخر کیا تو تمہارے لیے۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ تمام کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقتاً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے“ (ابراہیم: 32-34)۔

نتیجہ نکلا ہماری اس بحث کا تو یہ کہ پوری کائنات کی ہر حقوق کو خواہ وہ آسمان زمین سورج چاند ہوا پانی پہاڑ سمندر غرضیکہ کسی صورت میں ہوا اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی نشوونما اور ارتقاء میں لگا رکھا ہے۔ پھر انسان کی جسمانی ہی نہیں روحانی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت اور ساوی کتب کی تزیل کی شکل میں ایسے ہی عظیم منصوبے بنائے ہیں کہ ان ہی ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر حقوق کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ سورج چاند زمین آسمان وغیرہ میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی کام (Assignment) دے رکھا ہے۔ بلکہ چون و چرا اسی آلات کردہ کام کو کئے جانا ہر حقوق کی عبادت ہے۔ انسان کو بھی یقیناً کوئی کرنے کا کام دیا گیا ہے۔ بلکہ انسان یعنی جس لاڈلی حقوق کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر پوری کائنات اس کی خدمت میں لگا رکھی ہے ظاہر ہے اسے جو کام کرنے کو دیا گیا ہے وہ کام بھی انوکھا اور افضل ہونا چاہئے۔ کچھ ایسا ہی ہے پوری کائنات بشمول زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ جب کہ باقی کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت بلا واسطہ ہے اللہ تعالیٰ کے اپنے کئے گئے فیصلے کے مطابق زمین پر اس نے اپنی حکومت قائم کرنے کا کام انسانوں کو دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ہر دوسری حقوق کو انسان کیلئے مسخر کر رکھا ہے بلکہ اس انوکھی حقوق کو وہ صلاحیتیں (Faculties) اور سہولتیں (Facilities) دے رکھی ہیں جو کسی دوسری حقوق کو نہیں دیں۔ بولنے سننے سمجھنے فیصلہ کرنے اور سب سے بڑھ کر ایک مدت تک صوابدی اختیار انسان کو دے رکھے ہیں تو اس لیے کہ ان صلاحیتوں اور توانائیوں کے بغیر انسان وہ عظیم کام سرانجام نہیں دے پاتا جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے جس رکوع میں ”فی الارض خلیفہ“ بنانے کا ذکر کیا اسی رکوع میں خلیفہ نے جو کار خلافت ادا کرنا تھا اس کا بھی ذکر انسانوں کو زمین پر پہنچنے وقت کیا فرمایا:

”ہم نے کہا کہ ”تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“ (ہر قہ: 38-39)۔

یہ جہان کو دیا جانے والا کام کہ انسانی زندگی کے معاشرتی، معاشی، عدالتی، تعلیمی، غرضیکہ ہر دائرہ کار میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ خالص قوانین نافذ ہوں، کسی فرد یا ریاست یا ڈکٹیٹر وغیرہ کے خود ساختہ قوانین نافذ نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نظام خلافت قائم ہو۔

یاد رہے میرا آپ کا اس دنیا میں آنے والے ہر انسان کا فرض منہی ہے کہ ہم وہی کام کریں جو انبیاء نے کیا۔ خود بخود کائنات عالم دنیا میں تشریف لائے تھے تو دور جاہلیت تھا دنیا سے تشریف لے گئے تو دور خلافت تھا دور نبوت میں جو کام کیا گیا تو نظام خلافت قائم کرنے یا دوسرے لفظوں میں قرآن و سنت کے خالص قوانین نافذ کرنے کا۔ نوٹ فرمائیں وقت کے اس موڑ پر ہم انسانوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم پوری دنیا کو اسلام کی مملکت واحدہ کی شکل دیں جس کا آئین قرآن و سنت ہو۔ اس کے مقابلے میں خود ساختہ آئینی کتابچے بنا کر زندگیوں کو بے گناہ بناتے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے (ذاریات: 56) بناوٹ کیلئے قطعاً نہیں۔